الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

ناکامی کے اسباب ہمیشہ آدمی کے اپنے اندر ہوتے ہیں
مگر اکثر وہ ان کو دوسروں کے اندر تلاش کرنے لگتا ہے

شمارہ ۲۶
جنوری ۱۹۷۹

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۹

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

عن سعد قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرالرزق مایکفی وافضل الذکر الخفی

(احمد، ابن حبان، بیہقی)

حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین رزق وہ ہے جو بقدر ضرورت ہو اور افضل ذکر وہ ہے جو خفی ہو۔

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے "ایک سو"۔ اس کتاب میں ساری انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے آدمیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے، مصنف کے نزدیک، تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ کتاب کا مصنف نسلی طور پر عیسائی اور تعلیمی طور پر سائنس داں ہے۔ مگر اپنی فہرست میں اس نے نمبر ایک پر نہ حضرت مسیح کا نام رکھا ہے اور نہ نیوٹن کا۔ اس کے نزدیک وہ شخصیت جس کو اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نمبر ایک پر رکھا جائے وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپ نے انسانی تاریخ پر جو اثرات ڈالے وہ کسی بھی دوسری شخصیت، خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، نے نہیں ڈالے۔ مصنف نے آپ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

HE WAS THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMELY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS

Dr. Michael H. Hart, The 100, New York 1978

آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی۔ ٹامس کارلائل (انگریز) نے پیغمبر اسلام کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا تھا۔ مائیکل ہارٹ (امریکی) نے آپ کو ساری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اتنی واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیروؤں کے ایک "عقیدہ" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے اور ہر آدمی جو تاریخ کو جانتا ہے وہ مجبور ہے کہ اس کو بطور واقعہ تسلیم کرے۔

کوئی شخص اوپر نظر ڈالے تو اس کو ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آئے گا۔ اسی طرح انسانی زندگی میں جس طرف بھی دیکھا جائے، پیغمبر اسلام کے اثرات نمایاں طور پر اپنا کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ساری بہترین قدریں اور تمام اعلیٰ کامیابیاں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے وہ سب آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے براہ راست یا بالواسطہ نتائج ہیں۔ مذہبی اداروں میں شخصیت پرستی کے بجائے خدا پرستی کس نے قائم کی۔ اعتقادیات کو توہمات کے بجائے حق کی بنیاد کس نے عطا کی۔ سائنس میں فطرت کی پرستش کے بجائے فطرت کو مسخر کرنے کا سبق کس نے دیا۔ سیاسیات میں نسلی شہنشاہیت کے بجائے عوامی حکومت کا راستہ کس نے دکھایا۔ علم کی دنیا میں خیال آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کی طرح کس نے ڈالی۔ سماج کی تنظیم کے لئے ظلم کے بجائے عدل کی بنیاد کس نے فراہم کی۔ جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کو پیغمبر اسلام سے ملیں۔ آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس کی طرف حقیقی طور پر ان کارناموں کو منسوب کیا جاسکے۔ دوسرے تمام افراد آپ کے انقلابی دھارے کو استعمال کرنے والے ہیں نہ کہ اس کو وجود میں لانے والے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے۔ اس طرح معلوم تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا گیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر ڈالے وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب وہ اپنے رہنما کی تلاش میں نکلے تو اس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا بلند و بالا وجود اس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرے۔ آپ ساری انسانیت کے لئے ہادی اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لئے آپ کو اتنے بلند تاریخی مقام پر کھڑا کیا گیا ہے کہ کوئی آنکھ والا جب آنکھ اٹھائے تو آپ کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔

نعمتوں کا حق ادا کرو

والضحیٰ ۔ واللیل اذا سجیٰ ۔ ما ودعك ربك وما قلیٰ ۔ وللآخرة خیر لك من الاولیٰ ۔ ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ ۔ الم یجدك یتیماً فآویٰ ۔ ووجدك ضالاً فهدیٰ ۔ ووجدك عائلاً فاغنیٰ ۔ فاما الیتیم فلا تقهر ۔ واما السائل فلا تنهر ۔ واما بنعمة ربك فحدث

الضحیٰ

قسم ہے دھوپ کی اور رات کی جب چھا جائے ۔ تیرے رب نے تجھ کو نہیں چھوڑا اور نہ بیزار ہوا ہے ۔ اور بیشک آخرت بہتر ہے تیرے لئے دنیا سے ۔ اور تیرا رب تجھ کو دیگا پھر تو راضی ہوگا ۔ کیا اس نے تم کو یتیم پاکر جگہ نہ دی ۔ اور تجھ کو سرگرداں پایا تو راہ دکھائی ۔ اور تجھ کو نادار پایا تو مالدار کر دیا ۔ پس جو یتیم ہو اس کو نہ دبا ۔ اور مانگنے والے کو نہ جھڑک ۔ اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کر

ایک شخص جب دعوت حق کا کام لے کر اٹھتا ہے تو لوگوں کی طرف سے اس کو کبھی اچھا جواب ملتا ہے، کبھی برا ۔ کبھی روشن حالات سامنے آتے ہیں کبھی تاریک ۔ فرمایا کہ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ۔ کیوں کہ یہی دنیا کا نظام ہے ۔ یہاں روشنی اور تاریکی دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ۔ حق کے مسافر کو بھی کبھی امیدوں سے سابقہ پیش آئے گا، کبھی اندیشوں سے ۔ یہ سفر کبھی ہموار فضا میں طے نہیں ہوتا ۔ اگرچہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی اپنے دین کے خادموں کی مدد کرے گا، تاہم داعی کو اپنی ساری توجہ آخرت کی منزل پر لگائے رکھنا چاہئے جو ہر قسم کے خیر اور سکون کا واحد ابدی مقام ہے ۔ داعی کی نظر ان چیزوں پر نہیں ہونی چاہئے جو ابھی اس کو نہیں ملیں ۔ بلکہ اس کو دیکھنا چاہئے کہ جو چیزیں مل چکی ہیں ان کا حق ادا ہو رہا ہے یا نہیں ۔

اگلی آیتوں میں حق کی ادائگی کی صورت بتا دی ۔ تم یتیم ہو گئے تھے، اللہ نے تمھاری یتیمی کی تلافی کا انتظام کیا اس لئے تمہارے دل میں ان لوگوں کی جگہ ہونا چاہئے جو اپنے پیدائشی حالات کے نتیجہ میں بے جگہ ہو گئے ہوں ۔ تم بے مال تھے، اللہ نے تم کو معاشی سہارا فراہم کیا ۔ اس لئے تم کو بھی محروموں اور ضرورت مندوں کا خیر خواہ بننا چاہئے تم راہ سے بھٹکے ہوئے تھے، اللہ نے تم کو ہدایت یاب کیا ۔ اس لئے تم اس احسان کا شکر اس طرح ادا کرو کہ لوگوں کو ہدایت کے راستے پر لانے کی کوشش کرو ۔ جو نعمت ہدایت تم کو ملی ہے اس ہدایت کو دوسروں تک پہنچاؤ ۔

"سائل کو نہ جھڑکو" ——— کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی حق کی تلاش میں اللہ کے سامنے سائل بنے تو اللہ نے تم سے بے نیازی نہیں برتی ۔ یتیم اور نادار اور بے راہ ہونے کے باوجود پوری طرح تمھاری طرف توجہ دی اور تم کو تمھارے "سوال" کا مکمل جواب عطا فرمایا ۔ تمہارا بھی یہ حال ہونا چاہئے کہ جو کوئی تمہارے پاس اپنا سوال لے کر آئے، جو بھی تم سے حق کو جاننا چاہے اس کو تم نہ جھڑکو ——— یہ ایک انتہائی صورت کا حکم ہے ۔ کیوں کہ نیاز مندانہ سوال پر تو کوئی بھی شخص کسی کو نہیں جھڑکتا ۔ سائل کو جھڑکنے کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب کہ اس نے اپنے سوال کو بے ڈھنگے اور نامعقول انداز سے پیش کیا ہو ۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی سختی کے ساتھ سوال کرے تم اپنے جواب میں تلخی کا طریقہ نہ اختیار کرو بلکہ ہر حال میں نرمی اور شفقت کے ساتھ اس کا جواب دو ۔

سب سے بڑا اتحاد

میرے سامنے دیوار پر بیت اللہ کی تصویر ہے۔ وسیع مسجد کے درمیان کعبہ کی عمارت ہے اور اس کے چاروں طرف لاکھوں انسان گول دائرہ میں اپنے رب کے آگے جھکے ہوئے عبادت کر رہے ہیں۔ یہ سالانہ اجتماعی نماز ہے جو ہر بار حج کے مہینہ میں دنیا بھر کے ۲۵-۳۰ لاکھ مسلمان مکہ میں جمع ہو کر ادا کرتے ہیں اور جس کا فوٹو لیا جا سکتا ہے۔ لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو یہی واقعہ اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ہر روز پانچ بار ہوتا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اس طرح گویا ہر روز پانچ بار روئے زمین پر مسلمانوں کا گول دائرہ بنتا ہے۔ درمیان میں کعبہ ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کے گرد دائرہ بنائے ہوئے مسلمان نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عظیم اور مکمل اجتماعیت ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے مذہبی یا غیر مذہبی گروہ کے یہاں نہیں ملتی۔

اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان ہی وہ گروہ ہیں جو آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ غیر متحد ہیں۔ نہ کوئی دنیوی مقصد ان کو متحد کرنے میں کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور نہ کوئی اخروی مقصد۔ اتحاد کے اتنے شاندار امکانات کے باوجود اختلاف کی ایسی بری مثال انسانی تاریخ میں دوسری نہیں ملے گی۔

کعبہ

وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد دنیا بھر کے خدا پرستوں کا عبادتی دائرہ قائم ہوتا ہے۔

بعد کے دور میں لوگوں کی ہلاکت کا سب سے بڑا سبب باہمی اختلاف

عن عقبة بن عامر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج الیٰ قتلیٰ احد فصلی علیہم بعد ثمان سنین کالمودع للاحیاء والاموات ثم طلع الی المنبر فقال: انی بین ایدیکم فرط و انا شہید علیکم۔ وان موعدکم الحوض و انی لا نظر الیہ من مقامی ھذا۔ وانی واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم الدنیا ان تنافسوا فیھا وتقتتلوا فتھلکوا کما ھلک من کان قبلکم۔ قال عقبة فکانت آخر ما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر

(بخاری و مسلم)

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد کے آٹھ سال بعد احد کے مقام پر گئے اور وہاں شہید ہونے والوں کے لئے دعا فرمائی۔ ایسی دعا جو کوئی رخصت ہوتے وقت کرتا ہے۔ پھر آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ میں تمھارے لئے میرمنزل ہوں اور تمھارے اوپر گواہ ہوں۔ اور تم سے میری ملاقات کی جگہ حوض ہے۔ اس حوض کو میں یہیں سے دیکھ رہا ہوں۔ اور خدا کی قسم مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو گے بلکہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم دنیا کی حرص میں پڑ جاؤ گے اور آپس میں لڑو گے اور ہلاک ہو گے جس طرح پچھلی امتیں ہلاک ہوئیں۔

ذاتی شکایت کو دینی شکایت نہ بنانا

ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء (جلد ۱) میں طارق بن سہاب سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت خالد اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا۔ ایک شخص حضرت سعد کے پاس گیا اور حضرت خالد کے خلاف ان سے کچھ کہنے لگا۔ انھوں نے کہا: ٹھہرو۔ ہمارے اور ان کے درمیان جو جھگڑا ہے وہ ہمارے دین پر اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ (مه! ان ما بیننا لم یبلغ دیننا، طبرانی)

زبان اور ہاتھ کو آپس کی جنگ سے روکو

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ایک تلوار دی اور فرمایا:

یا محمد بن مسلمة جاھد بھذا السیف فی سبیل اللہ حتی اذا رأیت من المسلمین فئتین تقتتلان فاضرب بہ الحجر حتی تکسرہ ثم کف لسانک ویدک حتی تاتیک منیة قاضیة او ید خاطئة

(ابن سعد جلد ۳)

اے محمد بن مسلمہ! اس تلوار سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔ یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ مسلمان دو ٹولیوں میں بٹ کر آپس میں لڑ رہے ہیں تو اس تلوار کو پتھر پر مار کر توڑ دینا۔ پھر اپنی زبان کو اور اپنے ہاتھ کو روک لینا یہاں تک کہ تم کو موت آجائے یا کوئی خطاکار تم کو ہاتھ بڑھا کر قتل کر دے

باہمی جنگ میں دونوں فریق سے الگ رہو

وائل بن حجر رضؓ حضرموت کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ علی بن ابی طالب رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ کے درمیان خونِ عثمان کے مسئلہ پر جنگ ہوئی تو امیر معاویہ رضؓ نے وائل بن حجر رضؓ کو بلایا اور کہا کہ تم اس معاملہ میں ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے ۔ انھوں نے عذر کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فتنے تمھاری طرف آگئے جو اندھیری رات کے ٹکڑے کی طرح ہیں "، میں نے پوچھا کہ ہم اس وقت کیا کریں۔ آپ نے فرمایا : اے وائل! اسلام میں جب دو تلواریں چلیں تو تم دونوں تلواروں سے الگ رہنا (یا وائل اذا اختلف سیفان فی الاسلام فاعتزلهما، طبرانی)

حاکم کے ذمہ دوسروں کی اصلاح ، غیر حاکم کے ذمہ اپنی اصلاح

بیہقی نے سائب بن زید رضؓ کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا : میرے لئے کیا یہ بہتر ہے کہ اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ کروں یا اپنی ذات پر متوجہ رہوں ۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملہ کا ذمہ دار مقرر کیا جائے ، وہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ کرے ۔ اور جو شخص صاحب امر نہ ہو وہ اپنی ذات پر متوجہ رہے اور اپنے والی کی نصیحت کرے (اما من ولی من امر المسلمین شیئاً فلا یخاف فی اللہ لومة لائم ۔ ومن کان خلوا فلیقبل علی نفسه ولینصح لولی امره کنز العمال جلد ۳)

انفرادی شکایتوں کو ہر حال میں برداشت کرنا

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ اسلام کے ارادہ سے اپنے گھر سے نکلے اور مدینہ پہنچے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز پڑھا رہے تھے ۔ وہ نماز میں آخری صف میں شامل ہو گئے ۔ نماز کے بعد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ کلمہ توحید کے اقرار کے علاوہ آپ نے ان سے حسب ذیل چیزوں کے لئے بیعت لی : تمھارے اوپر اطاعت لازم ہوگی تنگدستی میں بھی اور آسائش میں بھی ۔ پسندیدگی میں بھی اور ناگواری میں بھی ۔ اور خواہ تمھارے اوپر دوسروں کو ترجیح دی جائے (علیك الطاعة فی عسرك ویسرك ، ومنشطك ومكرهك ، واثرة علیك ، کنز العمال جلد ۸)

اجتماعی امور میں امیر کی مکمل اطاعت

بیہقی نے عبداللہ بن یزید سے اور حاکم نے عبداللہ بن بریدہ سے روایت کیا ہے ۔ غزوۂ ذات السلاسل میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستہ روانہ کیا۔ اس دستہ میں ابوبکرؓ اور عمرؓ وغیرہ تھے۔ اس دستہ کا سردار آپ نے عمرو بن عاص کو مقرر کیا۔ وہ لوگ چلے یہاں تک کہ مقام جنگ کے قریب پہنچ گئے اور رات کو پڑاؤ کیا۔ عمرو بن عاص رضؓ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ آگ روشن نہ کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ کو یہ غیر ضروری مشقت معلوم ہوئی۔ وہ غصہ ہو گئے اور اٹھے کہ عمرو بن عاص رضؓ کے پاس جائیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو روکا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسی لئے تمہارے اوپر امیر بنایا ہے کہ ان کو جنگی معاملات سے زیادہ واقفیت ہے (لم یستعملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیك الا لعلمہ بالحرب)

حکمرانوں کو نصیحت تنہائی میں نہ کہ مجمع عام میں

حاکم نے جبیر بن نفیر سے روایت کیا ہے کہ عیاض بن غنم اشعری نے شہر دارا فتح کیا تو اس کے حاکم کو سزا دی۔ ہشام بن حکیم ان کے پاس آئے اور کہا: اے عیاض! کیا تم کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان اشد الناس عذابا یوم القیامة اشد الناس عذابا للناس فی الدنیا — قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس کا ہوگا جو دنیا میں لوگوں کو سخت عذاب دیتا تھا۔

ہشام سخت سست باتیں کہہ کر چلے گئے۔ چند روز کے بعد عیاض بن غنم ان سے ملے اور کہا اے ہشام ہم نے بھی وہ بات سنی ہے جو تم نے سنی ہے۔ اور وہ بات دیکھی ہے جو تم نے دیکھی ہے اور وہ صحبت اٹھائی ہے جو صحبت تم نے اٹھائی ہے۔ اے ہشام! کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا: جس کسی کو حاکم سے کوئی نصیحت کرنی ہو تو وہ علانیہ طور پر اس سے نہ کہے، بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو تخلیہ میں لے جائے اور تنہائی میں اس سے کہے۔ اگر حاکم نے قبول کر لیا تو قبول کر لیا۔ اور اگر نہیں قبول کیا تو آدمی نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور اس کا جو حق تھا اس کو ادا کر دیا۔ (من کانت عندہ نصیحة لذی سلطان فلا یکلمہ بہا علانیة ولیاخذ بیدہ ولیخل بہ، فان قبلہا قبلہا والا کان قد ادی الذی علیہ والذی لہ)

گروہی پکار جاہلیت کی پکار ہے

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ایک بار ہم لوگ کسی غزوہ میں تھے۔ مہاجرین میں سے ایک شخص نے انصار کے ایک شخص کی پیٹھ پر گھونسہ مار دیا۔ وہ شخص غصہ میں آگیا اور پکارا: یاللانصار (اے انصار مدد) دوسری طرف مہاجر نے آواز دی: یاللمہاجرین (اے مہاجرین مدد) دونوں گروہ جمع ہو گئے اور دونوں میں جھڑپ بھی شروع ہو گئی۔ پھر کچھ لوگوں نے درمیان میں پڑ کر فریقین کو ہٹا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: ما بال دعوی جاهلیة (یہ زمانہ جاہلیت جیسی باتیں کیوں ہو رہی ہیں) لوگوں نے کہا: اے خدا کے رسول ایک مہاجر نے ایک انصاری کو مار دیا تھا۔ آپ نے فرمایا: ان باتوں کو چھوڑو، یہ بدبودار باتیں ہیں (دعوها فانها منتنة، مسلم، احمد، بیہقی)

اختلافی محاذ بنانا سب سے زیادہ برا کام

امام احمد روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ابوذر رضی اللہ عنہ کے لئے کچھ چیزلے کر چلے۔ وہ ربذہ پہنچے تو وہاں ان کو نہ پایا۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ حج کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ وہ دوبارہ روانہ ہو کر منیٰ پہنچے۔ وہ لوگ ابوذر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ان سے کہا گیا: خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ نے یہاں چار رکعتیں پڑھی ہیں۔ یہ بات ابوذر رضی اللہ عنہ کو بہت گراں گزری۔ انھوں نے سخت الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہوں۔ آپ نے صرف دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر ابوبکر رض و عمر رض کے ساتھ بھی میں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا کی۔ لوگوں نے کہا: آپ نے امیرالمومنین پر چار رکعت کے لئے اعتراض کیا اور خود وہی کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا:

الخلاف اشد — مختلف عمل کرنا اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

اسی قسم کا واقعہ عبدالرزاق نے قتادہ رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ کے منیٰ میں چار رکعت پڑھنے پر نکیر کی اور پھر خود چار رکعت پڑھی۔ جب پوچھا گیا تو فرمایا: اختلاف کرنا شر ہے (الخلاف شرٌ)

اپنوں سے شکایت کا عذر لے کر دشمن سے مل جانا صحیح نہیں

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس غزوہ کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت میں کیا جب کہ کھجوروں کا پکنا اور درختوں کا سایہ لوگوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تیاری میں سستی کی۔ میرا گمان تھا کہ مجھ کو تو ہر طرح قدرت حاصل ہے۔ جب چاہوں گا روانہ ہو جاؤں گا۔ یہاں تک کہ لشکر روانہ ہو گیا اور میں ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو میں آپ سے ملا۔ آپ نے پوچھا: "تم کو کس چیز نے غزوہ میں شرکت سے روک دیا"۔ میں غلط بیانی نہ کر سکا۔ میں نے کہہ دیا: میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ میں جانے پر پوری طرح قادر تھا" اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کعب (اور ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع) سے کوئی بات نہ کرے۔ پچاس دن تک مدینہ میں ان کا مکمل بائیکاٹ جاری رہا۔ حتیٰ کہ ان کا وہ حال ہو گیا جس کی تصویر قرآن میں ان الفاظ میں ہے: زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی۔ ان کا اپنا وجود بھی ان پر بوجھ بن گیا۔ انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ کے سوا نہیں (توبہ ۱۱۸)

کعب بن مالک رض کہتے ہیں۔ اسی دوران ایک روز میں مدینہ کے بازار میں تھا کہ مجھے شام کا ایک نبطی ملا جو تجارت کی غرض سے مدینہ آیا تھا۔ اس نے مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا جو ریشم کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

"مجھے معلوم ہوا کہ تمھارے صاحب نے تم پر ظلم کیا ہے۔ خدا تم کو ذلت اور ضائع ہونے کی جگہ پر نہ رکھے۔ تم ہمارے پاس آجاؤ۔ ہم تمھاری قدر کریں گے۔"

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسی وقت اس کو آگ میں ڈال دیا — پچاسویں دن اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی۔

ورنہ دشمن تمھارے اوپر مسلط ہو جائیں گے

ابن ابی شیبہ نے شمر کے واسطے سے ایک شخص کی روایت نقل کی ہے۔ اس نے کہا کہ میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں عریف (قبیلہ کا چودھری) تھا۔ آپ نے ہم کو کسی چیز کا حکم دیا۔ کچھ دن کے بعد آپ نے پوچھا: کیا تم نے وہ کام کر دیا جس کا میں نے تمھیں حکم دیا تھا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ خلیفہ چہارم نے فرمایا: خدا کی قسم تم لوگ ضرور اس کام کو کرو جس کا تمھیں حکم دیا جائے ورنہ یہود و نصاریٰ تمھاری گردنوں پر سوار ہو جائیں گے (واللہ لتفعلن ماتومرون به اولتركبن اعناقكم اليهود والنصارىٰ، کنز العمال)

باہمی لڑائی خدا کی مدد سے محروم کر دیتی ہے

حضرت خباب بن الارت کہتے ہیں کہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عادت کے خلاف بہت لمبی نماز پڑھی۔ صحابہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو فرمایا: یہ رغبت اور ڈر کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں کیں۔ ان میں سے دو قبول ہو گئیں۔ ایک کے بارے میں انکار کر دیا گیا۔

فرمایا: میں نے یہ دعا کی کہ میری ساری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جائے۔ یہ قبول ہو گئی۔ دوسری دعا یہ کی کہ ان پر کوئی ایسا دشمن مسلط نہ ہو جو ان کو بالکل مٹا دے۔ یہ بھی قبول ہو گئی۔ تیسری دعا یہ کی کہ ان میں آپس میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔ یہ بات منظور نہیں ہوئی۔"

اختلاف کی قیمت پر سرداری قبول نہ کرنا

ابن سعد نے حضرت میمون کے واسطہ سے ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

قال دس معاوية عمرو بن العاص وهو يريد يعلم ما في نفس ابن عمر۔ يريد القتال ام لا۔ فقال يا ابا عبد الرحمٰن! ما يمنعك ان تخرج فنبايعك وانت صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم وابن امير المومنين وانت احق الناس بهذا الامر

وہ کہتے ہیں۔ امیر معاویہ رض نے عمرو بن العاص رض کو حیلہ کر کے عبد اللہ بن عمر رض کے پاس بھیجا، وہ جاننا چاہتے تھے کہ (خلافت کے بارہ میں) عبد اللہ بن عمر رض کے دل میں کیا ہے۔ وہ لڑنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ عمرو بن العاص رض ان کے پاس آئے اور کہا: اے ابو عبد الرحمٰن!

قال وقد اجتمع الناس كلهم على ما تقول ۔ قال نعم الا نُفَیر یسیر۔ قال لو لم یبق الا ثلاثة اعلاج بهجر لم یکن لی فیها حاجة۔ قال فعلم انه لا یرید القتال
(طبقات ابن سعد جلد ۴)

آپ کو کیا چیز روکے ہوئے ہے کہ آپ نکلیں تاکہ ہم لوگ، آپ سے بیعت کریں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور امیر المومنین کے صاحبزادے ہیں۔ آپ اس کام کے لئے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ انھوں نے کہا ہاں، سوا تھوڑے لوگوں کے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا اگر ہجر کے تین موٹے عجمی آدمی بھی باقی رہ جائیں تو مجھے اس کام (خلافت) کی حاجت نہیں۔

عبادت، اتحاد، خیر خواہی

عن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ یرضی لکم ثلاثا۔ یرضی لکم ان تعبدوہ ولا تشرکوا به شیئا، وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا، وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم (صحیح مسلم)
حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تم سے تین باتوں پر راضی ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور باہم متفرق نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اللہ تمھارے اوپر جس کو حکمراں بنائے، اس کے ساتھ خیر خواہی کرو۔ اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منی میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ثلاث لا یغل علیهن قلب امرئ مسلم: اخلاص العمل للہ، ومناصحة ولاة الامر ولزوم جماعة المسلمین (مسند احمد)
تین چیزیں ہیں جن میں مومن کا قلب دھوکا نہیں کرتا۔ عمل میں اللہ کے لئے اخلاص، اپنے حاکموں کی خیر خواہی، مسلمانوں کی جماعت کو پکڑے رہنا۔

اجتماعی کام میں انفرادی جھگڑوں سے پرہیز

معاہدہ حدیبیہ کے بعد جب عرب میں امن قائم ہوگیا اور راستے محفوظ ہو گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ ۶ ھ میں اپنے اصحاب کو جمع کر کے ان کو عمومی دعوتی کام کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے فرمایا "اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تم لوگ اس پیغام کو میری طرف سے تمام قوموں تک پہنچا دو۔ اور اختلاف میں نہ پڑنا جس طرح بنو اسرائیل نے عیسیٰ بن مریم سے اختلاف کیا" آپ کے اصحاب نے جواب دیا: اے خدا کے رسول ہم آپ سے کسی بھی چیز میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے (یا رسول اللہ انا لا نختلف علیک فی شیئ ابدا فمرنا وابعثنا، البدایہ والنہایہ)

مطالعۂ حدیث

مَن لبس ثوب شھرۃ البسہ اللّٰہ ثوب مذلۃ یوم القیامۃ (احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

جو شخص شہرت کا لباس پہنے، اللہ اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا۔

اس حدیث کا ایک تعلق نمائشی لباس سے ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اگر شہرت پسندی میں مبتلا ہو تو اس کا یہ مزاج اس کو آخرت کی دنیا میں رسوا کرنے والا ثابت ہوگا۔ خاموش کاموں سے بے رغبت ہونا اور ایسے کاموں کے لئے دوڑنا جس میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہے، جس سے آدمی کی امیج بڑھتی ہے، جس میں عوامی استقبالئے وصول ہوتے ہیں۔ یہ سب شہرت کے وہ لباس ہیں جو اللہ کو ناپسند ہیں اور آخرت کی ابدی زندگی میں وہ آدمی کے لئے رسوائی کا لباس بن کر ظاہر ہوں گے۔

مَن ذَکَرَ امْرَأً بِشَیءٍ لَیْسَ فِیہِ لِیُعِیبَہ بِہ حَبَسَہُ اللّٰہُ فِی نَارِ جَھَنَّمَ حَتّٰی یَاتِیَ بِنِفَاذِ مَاقَالَ فِیہِ (الطبرانی)

جس نے کسی شخص کے بارے میں ایسی بات کہی جو اس کے اندر نہیں ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس کو عیب لگائے تو اللہ اس کو جہنم کی آگ میں روکے گا یہاں تک کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کے حق میں وہ کوئی ثبوت لائے

گویا ایسی تنقید کرنا انگاروں سے کھیلنا ہے جب کہ کسی کی طرف ایسے خیالات منسوب کرکے اس کو نشانۂ تنقید بنایا جائے جو اس نے نہیں کہے یا اس کو ایسی علمی اور اخلاقی کمزوریوں کے لئے متہم کیا جائے جو محض الزام کی حیثیت رکھتی ہوں اور جن کی موجودگی کا کوئی واقعی ثبوت ناقد کی طرف سے پیش نہ کیا گیا ہو۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ تعالیٰ لا یمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن۔ ان الخبیث لا یمحو الخبیث (احمد وغیرہ)

اللہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ گندگی کبھی گندگی کو نہیں مٹا سکتی۔

اس حدیث کا ایک پہلو وہ ہے جو انفرادی زندگی سے متعلق ہے۔ ایک شخص کو اپنے پڑوسی سے یا کسی اور سے برے سلوک کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں اگر وہ بھی اس کے ساتھ برا سلوک کرنے لگے تو اس سے برائی میں صرف اضافہ ہوگا۔ اس سے برائی ختم نہیں ہو سکتی۔ برائی کو ختم کرنے کی واحد صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف سے اگر برائی کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف سے اچھائی کا اظہار کیا جائے۔

یہی اصول اجتماعیات کے لئے بھی صحیح ہے۔ ایک قوم اگر تعصب اور فساد کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو دوسری قوم جوابی نفرت اور تعصب سے اس کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ ایک حکمراں اگر ظلم کرتا ہے تو ہنگاموں اور توڑ پھوڑ کی سیاست سے اس کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک گروہ اگر سماجی اور اقتصادی استحصال کرتا ہے تو دوسرا گروہ شور و غل یا منفی تدبیروں سے اس کو دور نہیں کر سکتا۔

ٹیڑھی کھیر

"آپ ہم کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں" ایک غیر مسلم نے کہا "مگر اسلام وہی تو ہے جس نے موجودہ ایران میں مسلمانوں مسلمانوں کو لڑا رکھا ہے۔ پاکستان میں اسی اسلام کے نام پر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور ان کی لڑائی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کیا اسی آپسی لڑائی والے دین کو اب آپ ہمارے ملک میں بھی داخل کرنا چاہتے ہیں"۔

غیر مسلم بھائی کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے "ٹیڑھی کھیر" کا لطیفہ یاد آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نابینا کو ایک شخص نے کھانے کی دعوت دی۔

"آپ کیا کھلائیں گے"، نابینا نے پوچھا۔

"کھیر کھلاؤں گا"۔

"کھیر کیا چیز ہوتی ہے"، نابینا نے دوبارہ سوال کیا۔

"کھیر سفید ہوتی ہے"

"کیسی سفید"

"جیسے بگلا"

"بگلا کیسا ہوتا ہے، میں نے تو اس کو کبھی نہیں دیکھا"

اب دعوت دینے والے نے اپنے ہاتھ کو بگلے کی شکل کا بنا کر نابینا کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے۔ نابینا نے ٹٹول کر دیکھا تو وہ اس کو ایک ٹیڑھی سی چیز معلوم ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ کھیر کوئی ٹیڑھی میڑھی چیز ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ ایسی ٹیڑھی چیز اگر میں نے کھائی تو کہیں وہ میرے گلے میں نہ پھنس جائے۔ اس نے کہا "بھائی! مجھے ایسی ٹیڑھی کھیر سے معاف رکھو۔ میں تمہاری دعوت نہیں کھاؤں گا"۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بھی دین اسلام کو ایسا ہی ٹیڑھا دین بنا رکھا ہے۔ اسلام کے نام پر طرح طرح کے مذہبی، سیاسی اور معاشی جھگڑے برپا ہیں۔ اسلام دین رحمت تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کو دین منازعت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ "ٹیڑھا دین" ہر ایک لئے پھرتا ہے۔ مگر سیدھا سچا دین کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسلام کے یہ نادان دوست اگر اسلام کا نام لینا چھوڑ دیں تو وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کریں گے۔

یہ دین داری نہیں نفس پرستی ہے

بہت سے لوگ شعبان کی پندرہ تاریخ کو حلوا پکاتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ اس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت شہید ہوا تھا اور اسی بنا پر کوئی سخت چیز کھانے کے بجائے آپ نے حلوا تناول فرمایا۔

یہ بات تاریخ کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ محدثین اور ارباب سیر کے اتفاق کے مطابق آپ کا دانت غزوۂ احد میں شہید ہوا تھا اور غزوۂ احد شوال (۳ھ) میں پیش آیا ہے نہ کہ شعبان میں۔ نیز اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس دن آپ نے حلوا نوش فرمایا۔

دانت شہید ہونے کے واقعہ سے "حلوا" کھانے کی سنت تو نکال لی گئی۔ مگر کسی کو اس سے دل چسپی نہیں کہ یہ بھی معلوم کرے کہ وہ کون سا فرض تھا جس کی ادائگی کے لئے آپ نے اتنی سرگرمی دکھائی کہ آپ کے دانت تک شہید کر دیئے گئے۔ یہ دین داری نہیں، دین کے نام پر نفس پرستی ہے۔

جب دلیل، دلیل نظر نہ آئے

ایک گروہ جو آسمانی کتاب کا حامل ہو، اس کی گمراہی یہ نہیں ہوتی کہ وہ دین سے بالکل بے تعلق ہو جائے۔ اس کی گمراہی تحریف (نساء ۴۶) ہے۔ یعنی خود ساختہ دین پر چلنا اور لفظی تاویلوں اور تشریحوں کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا کہ یہی عین خدا اور رسول کا دین ہے۔ بالفاظ دیگر، دین کا نام لیتے ہوئے بے دینی اختیار کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے جو دین مقرر کیا ہے، اس کی ایک سیدھی شاہراہ (صراط مستقیم) ہے۔ یہ شاہراہ ہے ——— اللہ پر یقین، آخرت کا خوف، خشوع اور انابت، بندوں کے ساتھ خیر خواہی، معاملات میں انصاف، بے لاگ حق پرستی، دعوت الی اللہ وغیرہ۔ یہی وہ اصل چیزیں ہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں سارا قرآن ان کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ ان کیفیات و اعمال کے ساتھ جو زندگی بنتی ہے اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے بعد جب قوموں میں قساوت (حدید ۱۶) آجاتی ہے اور دھیرے دھیرے آخرت کا فکر کمزور پڑجاتا ہے تو دنیا پرستی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اب لوگوں کے اندر ایک اور دین ابھرنا شروع ہوتا ہے۔ یہ ہے دنیا رخی دین جس کو قرآن میں آخرت کے بدلے دنیا خریدنا (بقرہ ۸۶) کہا گیا ہے۔ یعنی اپنی دنیا پرستانہ زندگی پر دین کا لیبل لگانا، خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ دنیوی اعمال کو آخرت کی کامیابی کا سبب بتانا۔ اسلام حقیقۃً یہ ہے کہ اپنی زندگی کو خدائی مرضیات کے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ مگر اب ایک ایسا اسلام وجود میں آتا ہے جس میں آدمی خود اسلام کو اپنے اوپر ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔ آپ اسلام کے پیچھے چلنے کے بجائے اسلام کو اپنے پیچھے چلانا شروع کر دیتا ہے۔

لوگ اصل دینی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے اپنے ذوق کے تحت مختلف سمتوں میں منحرف ہونے لگتے ہیں۔ کسی کا منطقی مزاج غیر ضروری قسم کی مذہبی بحثیں ایجاد کرتا ہے اور وہ ان مباحث کا پہلوان بن کر ابھرتا ہے۔ کوئی دنیوی مسائل اور سیاسی جھگڑوں کو اسلامی اصطلاحات میں بیان کرتا ہے اور ان کا علم بردار بن کر مجاہد اسلام کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی جھوٹے قصے کہانیاں گھڑ کر اسلام کا ایک طلسماتی مجموعہ تیار کرتا ہے اور ان کو سنا سنا کر عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ کوئی اسلام کا ایک برکتی ایڈیشن وضع کرتا ہے اور بہت سے لوگ اس کو ایک پراسرار دنیوی نسخہ سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ کوئی انسان کے بنائے ہوئے "ازموں" کے ساتھ اسلام کا لفظ شامل کر کے ان تمام لوگوں کی قیادت حاصل کر لیتا ہے جو ان ازموں (نظاموں) کے فریب میں ہیں اور اسی کے ساتھ اسلام کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ کچھ لوگ سارا معاملہ اس خوش عقیدگی پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ محبوب خدا کی امت ہیں اور قیامت کے دن وہ بہر حال بخش دیئے جائیں گے۔ غرض اصل شاہراہ دین کے دائیں بائیں بہت سی خود ساختہ راہیں نکال لی جاتی ہیں اور لفظی تاویلات یا گھڑے ہوئے افسانوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ عین دینی ہیں۔ بلکہ یہی وہ دین ہے جس کے لئے تمام انبیا، اس دنیا میں بھیجے گئے۔

کوئی اہل کتاب گروہ جب دین کی اصل شاہراہ کو چھوڑ کر اس طرح منحرف راستوں پر چل پڑتا ہے تو وہ اللہ کی نظر میں سخت مبغوض ہوجاتا ہے۔ اس کا جرم عام انسانوں کے مقابلہ میں دگنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ بے دینی کو دین کے نام پر کر رہا ہے۔ وہ دین خداوندی کا نمائندہ ہوکر لوگوں کے سامنے غلط دین کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یہود کا جرم یہی تھا جس کے نتیجہ میں ان کو یہ سخت انتباہ دیا گیا:

یاایھا الذین اوتوا لکتٰب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علیٰ ادبارھا او نلعنھم کما لعنا اصحٰب السبت و کان امر اللّٰہ مفعولا (نساء ۴۷)

اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ وہ سچا کرنے والی ہے اس چیز کو جو تمہارے پاس ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم مٹا ڈالیں چہروں کو۔ پھر ان کو پیٹھ کی طرف الٹ دیں یا ان کو لعنت کریں جیسے لعنت کی ہم نے اصحاب سبت کی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔

"چہرہ کو بگاڑ کر پیچھے پھیر دینے"، کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی جائے گی۔ چہرہ آدمی کی باطنی قوتوں کا مظہر ہے۔ وہ سمع وبصر و فواد کا آئینہ ہے۔ اس لئے چہرہ کو الٹ دینے کا مطلب دیکھنے اور سننے اور سمجھنے کی صلاحیت کو الٹ دینا ہے۔ کتاب آسمانی کے حاملین کی گمراہی کا مطلب یہ ہے کہ حقائق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ پھر بھی وہ ان کو چھوڑ کر منحرف راستوں پر دوڑتے ہیں۔ عام لوگوں کی گمراہی اگر غفلت ہے تو ان کی گمراہی سرکشی۔ اس لئے اس اعراض کی سزا ان کو یہ ملتی ہے کہ ان کی قوتوں کو مسخ کر دیا جاتا ہے۔

سخت سزا کی وجہ ان کے معاملہ کی خصوصی نوعیت ہے۔ اللہ کی کتاب ان کے سامنے موجود ہے۔ رسول کی سنت ان کو راستہ دکھا رہی ہے۔ خدا کی نشانیاں ان کے سامنے کھلی ہوئی ہیں اس کے باوجود وہ جھوٹے الفاظ بول بول کر اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ آنکھوں والے ہوکر اندھے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے جرم کی شناعت کو بہت بڑھا دیتی ہیں۔ اللہ کا غضب ان پر بھڑکتا ہے۔ ان کو یہ سخت ترین سزا دی جاتی ہے کہ ان کی عقل کو الٹ دیا جاتا ہے۔ ان کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ چیزوں کی حقیقت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سیدھی بات ان کو الٹی نظر آتی ہے اور الٹی بات سیدھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتے کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت ان کے لئے روشنی کا کام دے سکے۔

آدمی کی عقل ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی نیک وبد کو سمجھتا ہے۔ ایک راہ کو چھوڑنے اور دوسری راہ کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جب عقل کو الٹ دیا جائے تو پھر وہ کسی معاملہ کی حقیقت کو کس طرح سمجھے گا۔ اس کے بعد آدمی کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ گمراہیوں میں بھٹکتا رہتا ہے، حق کی کوئی آواز اس کی اصلاح کے لئے کارگر ثابت نہیں ہوتی —— وہ تعمیر ملت کے نام پر بے معنی چیخ پکار میں مشغول ہوتا ہے اور ساری تاریخ اس کو یہ سبق دینے سے عاجز رہتی ہے کہ دوسروں کے خلاف چیخ پکار سے کبھی کسی قوم کی تعمیر نہیں ہوتی۔ وہ سیاسی مظاہروں کو حق کی شہادت کا نام دیتا ہے اور تمام انبیاء کا اسوہ اس کو یہ بتانے کے لئے ناکافی ثابت ہوتا ہے کہ شہادت کا کام آخرت

کی گواہی دینا ہے نہ کہ سیاسیات اور معاشیات کی گواہی دینا۔ وہ لفظوں کے ورد سے جنت کے محل تعمیر کرتا رہتا ہے اور خدا کی کتاب اپنی تمام وضاحتوں کے باوجود اس کو بتا نہیں پاتی کہ جنت کسی آدمی کو جنت والے عمل سے ملتی ہے نہ کہ صرف لسانی اوراد سے۔

یہی حال رفتہ رفتہ اس کی تمام دینی و ملی سرگرمیوں کا ہو جاتا ہے — وہ خود ساختہ موشگافیوں کو دینی تعلیم قرار دیتا ہے اور رسول اور اصحاب رسول کی پوری زندگی اس کو یہ بتانے میں ناکام رہتی ہے کہ دینی تعلیم کتاب اللہ کے حقائق و معارف کو ذہن میں اتارنے کا نام ہے نہ کہ ایسے مسائل میں لامتناہی بحث جاری رکھنے کا جن سے کتاب و سنت ناآشنا ہوں۔ وہ خود ساختہ عملیات اور وظائف پر روحانی ترقی کی عمارت کھڑی کرتا ہے اور یہ واقعہ اس کی آنکھ کھولنے والا ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کے رسول نے اپنے اصحاب کو روحانی ترقی کا جو طریقہ بتایا اس میں اس قسم کے عملیات و وظائف کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ دنیوی حقوق و مطالبات پر ملی سیاست کا بازار گرم کرتا ہے اور یہ عظیم حقیقت اس کے قدموں کو نہیں روکتی کہ اللہ کے پیغمبروں کا اسوہ جو اللہ کی کتاب میں بیان ہوا ہے اس کے یہ سراسر خلاف ہے کہ داعی گروہ اپنی مدعو قوم سے دنیوی مفادات کے جھگڑے چھیڑ دے۔ وہ سیاسی اقتدار قائم کرنے کو امت مسلمہ کا اصل مشن بتاتا ہے اور یہ واقعہ اس کے یقین میں کوئی تزلزل پیدا نہیں کرتا کہ آسمانی کتاب کے پورے متن میں کوئی فقرہ ایسا نہیں ہے جس کے عبارت النص سے یہ حکم نکلتا ہو کہ "اے مسلمانو تمہارا نصب العین یہ مقرر کیا گیا ہے کہ تم دنیا بھر میں اپنی سیاست کا جھنڈا گاڑ دو"۔ وہ "نظام اسلام" کا نام لے کر مسلم آبادیوں میں توڑ پھوڑ مچاتا ہے اور یہ حقیقت اس کے جوش تخریب میں کمی کرنے والی ثابت نہیں ہوتی کہ خدا کا پیغمبر سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس بات کو اس نے مطلق حرام قرار دیا تھا کہ کوئی بھائی اپنے دوسرے بھائی کی جان و مال پر دست درازی کرے۔

جب کسی گروہ کی عقل الٹ جائے تو اس کو نہ حق حق کی صورت میں دکھائی دے گا اور نہ باطل باطل کی صورت میں۔ دلائل اس کو بے وزن معلوم ہوں گے۔ کھلی ہوئی نشانیاں اس کے سامنے آئیں گی مگر وہ اس کو دکھائی نہ دیں گی۔ الٹی باتیں اس کو سیدھی نظر آئیں گی اور جو سیدھی بات ہے وہ اس کو الٹی دکھائی دے گی۔ اس کا حال ان لوگوں جیسا ہو جائے گا جن کی نشان دہی قرآن میں ان لفظوں میں کی گئی ہے:

وان یروا کل آیۃ لا یومنوا بھا۔ وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا۔ وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا۔ ذلک بانھم کذبوا بآیاتنا وکانوا عنھا غفلین

(اعراف ۱۴۶)

اور اگر وہ دیکھیں ساری نشانیاں یقین نہ کریں ان کو۔ اور اگر دیکھیں راہ سنوار کی وہ نہ ٹھیرائیں اس کو راہ۔ اور اگر دیکھیں راہ الٹی اس کو ٹھیرائیں راہ۔ یہ اس واسطے کہ انھوں نے جھوٹ جانیں ہماری نشانیاں اور ہو رہے وہ ان سے غافل۔

اس دور کا مذہب : ہیرو ازم

پوپ کا عہدہ روایتی طور پر اطالوی مسیحیوں کے لئے مخصوص تھا۔ موجودہ پوپ پہلے غیر اطالوی ہیں جو ساڑھے چار سو سال کے بعد پوپ کے عہدہ پر فائز ہوئے ہیں۔ ان کا قدیم نام ووجی لا (Wojtyla) ہے اور موجودہ لقب پوپ جان پال دوم۔ وہ پولینڈ کے رہنے والے ہیں۔ پولینڈ کی آبادی میں ۹۰ فی صد لوگ کیتھولک عیسائی ہیں۔ مزید یہ کہ یہاں پادریوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ پولینڈ ایک اشتراکی ملک ہے۔ فادر ووجی لا نے اس سے پہلے اپنے ملک میں مسیحیت کی آزادی کے لئے زبردست جدوجہد کی اور کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کے فاتحانہ کارناموں نے ان کو مسیحی حلقوں میں ہیرو کا مقام دے دیا۔ اس تجربہ کے بعد پولینڈ میں ایسی فضا بن گئی کہ مسیحی کاز کے لئے اٹھنا ہیرو بننے کے ہم معنی ہو گیا۔ چنانچہ نوجوان طبقہ کثرت سے اس طرف مائل ہونے لگا۔ پولش چرچ کے ایک ذمہ دار نے کہا ہے:

Our young men are becoming priests, because in Poland this is an act of heroism.

The Illustrated Weekly of India, Oct.29,78

ہمارا نوجوان طبقہ پادری بن رہا ہے۔ کیونکہ پولینڈ میں پادری بننا ہیرو بننا ہے۔

ہیرو بننے کا شوق موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا شوق ہے۔ عام نوجوان فلمی ہیروؤں کی نقل کر کے اپنے جذبہ کی تسکین کرتے ہیں اور بڑے لوگ اسٹیج پر چمتکار دکھا کر۔ فرق یہ ہے کہ کوئی روحانی اسٹیج پر یہ چمتکار دکھا رہا ہے اور کوئی سیاسی اسٹیج پر۔

فطرت سے بغاوت کے بعد

۲۵ سال پہلے ایک شخص نے امریکہ میں اپنی جنس تبدیل کرائی تھی۔ یعنی ایک مرد آپریشن کے ذریعہ عورت بن گیا۔ آج کل امریکہ میں سالانہ ایک سو کی تعداد میں جنسی تبدیلی کے آپریشن ہو رہے ہیں۔ جرمنی میں اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد تین ہزار ہے جنھوں نے اپنی جنس تبدیل کرائی ہے۔ ان میں زیادہ تر مرد ہیں۔

مگر اس "تفریح" نے مغربی سماج میں نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر گرناٹ ہاف من (جرمنی) ایک مرد تھا۔ اس نے آپریشن کے ذریعہ عورت کی جنس حاصل کر لی۔ مگر قانون ابھی اس کو عورت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ قانونی طور پر اب بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ بطور مرد ڈاکٹر کے کام کرے اور مرد ڈاکٹروں کا سا لباس پہنے۔ اس قسم کے بہت سے قانونی مسائل ہیں جن کو حل کرنے کے لئے نیا قانون بنایا جا رہا ہے۔ مگر ماہرین شبہ کر رہے ہیں کہ محض قانون سازی اس نئی نوع کے مسائل کو حل کر دے گی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تبدیلئ جنس کے کچھ عرصہ بعد ایسے لوگ انتشار ذہنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جنس تبدیل کرنے والوں (Transsexuals) میں خودکشی کی شرح دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پائی گئی ہے۔

دعا

سچی دعا یہ ہے کہ دعا کرنے والا دوسرے انسانوں کے ساتھ وہی مہربانی کرنے لگے جس مہربانی کو وہ اپنے رب سے خود اپنے لئے مانگ رہا ہے

قرآن میں مختلف مقامات پر دعا کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ انہ لا یحب المعتدین ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا وادعوہ خوفا وطمعا ان رحمت اللہ قریب من المحسنین (اعراف ۵۶-۵۵)

پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ پسند نہیں کرتا حد سے نکل جانے والوں کو۔ اور مت خرابی مچاؤ زمین میں اس کی درستی کے بعد۔ اور پکارو اس کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے۔ یقیناً اللہ کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں سے۔

اس موقع پر احسان کا مطلب ہے دعا کے موافق عمل کرنا۔ دوسری جگہ یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی مسلمین حم سجدہ ۳۳

اور کون شخص ہے بہتر بات میں اس شخص سے کہ پکارے اللہ کی طرف اور صالح عمل کرے اور کہے کہ میں حکم بردار ہوں

دعا کیا ہے۔ بندے کا اعترافِ عجز اپنے رب کے سامنے۔ جب ایک شخص اللہ پر اس حد تک یقین اور بھروسہ کر لیتا ہے کہ اس کی ساری امیدیں بس ایک اللہ سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور سے نہ اس کو پانے کی امید ہوتی ہے اور نہ چھننے کا اندیشہ۔ اس وقت اس کی زبان سے جو بیتابانہ کلمات نکل پڑتے ہیں، اسی کا نام دعا ہے بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کی سپردگی میں دے دیتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ میرے رب! مجھے اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔ تیرے سوا کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔ تیرے سوا کوئی کسی کو سایہ نہیں دے سکتا۔

دعا کے یہ الفاظ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعا ہیں جب کہ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) سے اس کی تصدیق ہو رہی ہو۔ آدمی اپنے رب سے اپنے لئے جس رحمت اور عفو و درگزر کا طالب ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت اور عفو و درگزر کا وہی طریقہ اختیار کرنا زمین کی اصلاح ہے۔ اور جب ایسا ہو کہ آدمی اپنے لئے تو رحمت اور عفو و درگزر کا امیدوار ہو اور خود دوسرے انسانوں کے ساتھ سرکشی اور بے پروائی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کا نام زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ اللہ کے سامنے حد بندگی میں ہونے کا اقرار کرنا اور دنیا کی زندگی میں جب دوسرے انسانوں سے عملی سابقہ پیش آئے تو حد بندگی سے نکل جانا ایسا تضاد ہے جو ایک طرف زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے اور دوسری طرف آدمی کی دعا کو اللہ کی نظر میں بالکل بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی اپنی دعا کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مگر اس بات کا ثبوت اس کو انسانی تعلقات ہی میں دینا ہے کہ وہ اپنی دعا میں محسن ہے یا نہیں۔ جو شخص انسانی تعلقات میں اپنی دعائیہ حیثیت کو بھول جائے اس کی مثال ایسے آدمی کی ہے جس نے زبان سے بڑے بڑے دعوے کئے مگر جب اس کا امتحان لیا گیا تو وہ صفر سے زیادہ نمبر حاصل نہ کر سکا۔

آپ اپنے رب سے امید وار ہیں کہ وہ آپ کی کوتاہیوں کو نہ دیکھے بلکہ اپنی شان کریمی کے تحت آپ سے معاملہ فرمائے۔ اگر آپ فی الواقع اس پکار میں سچے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دنیا کی زندگی میں جب آپ کا معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے اوپر آپ قابو یافتہ ہوں تو آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی بے بسی یاد آجائے اور آپ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کریں۔ آپ کو اللہ کے عذاب کا ڈر ہے۔ آپ اس کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سے دعا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ جب کوئی انسان آپ کی گرفت میں آجائے تو آپ اس کے ساتھ غصہ اور انتقام کے تحت کارروائی نہ کریں بلکہ فیاضی اور حسن سلوک کے ساتھ معاملہ کر کے اللہ سے کہیں کہ خدایا تو بھی مجھ سے فیاضی کا معاملہ فرما۔ آپ اللہ کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنی عاجزی کا اعتراف کر رہے ہیں، اس اعتراف میں آپ اس وقت سنجیدہ ہیں جب کہ آپ کا یہ حال ہو کہ آپ ایک انسان پر قدرت پالیں اور اس پر اپنی کبریائی کا مظاہرہ کر سکتے ہوں مگر اس وقت آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت یاد آجائے اور آپ اپنے رب سے یہ کہتے ہوئے اس شخص کو چھوڑ دیں کہ خدایا میں نے اس سے درگزر کیا تو بھی مجھ سے درگزر فرما۔"

اس کے برعکس اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ اللہ کے سامنے عاجزی کے کلمات دہرائیں اور اس کے بعد بندوں کے ساتھ گھمنڈ اور سرکشی کا طریقہ اختیار کریں۔ اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں اور اپنے بھائی کی خطائیں معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اللہ سے امید وار ہوں کہ وہ آپ کی حاجتیں پوری کرے اور آپ کا سابقہ جب کسی دوسرے محتاج انسان سے پڑے تو اس کی حاجت پوری کرنے کا کوئی جذبہ آپ کے اندر نہ ابھرے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دعا کے ساتھ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) نہیں کر رہے ہیں۔ آپ اپنی دعا میں مخلص نہیں ہیں۔ ایسی دعا کی اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ ایسی دعا حقیقۃً دعا نہیں بلکہ سوانگ ہے اور سوانگ کسی شخص کو سزا کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام کا۔

دعا کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ برکت والے الفاظ ہیں، ان کو رٹ کر صحتِ ادا کے ساتھ دہرا دو اور پھر ان کے جادوئی اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ خدا اور بندے کا معاملہ اس قسم کا مشینی معاملہ نہیں ہے۔ خدا الفاظ کو نہیں خود آپ کی ہستی کو دیکھتا ہے۔ خدا کو وہ کلمات درکار ہیں جو آدمی کی اپنی پکار بن کر نکلے ہوں۔ جو اس واقعہ کا ایک فطری اظہار ہوں کہ بندہ صرف ایک اللہ سے ڈرتا ہے اور صرف اسی سے امید رکھتا ہے۔ اس کے احساسات اپنے رب سے اس طرح وابستہ ہو گئے ہیں کہ ہر آن وہ اس سے مصروفِ کلام رہتا ہے، کبھی دل سے اور کبھی زبان سے۔ دعا دراصل پگھلے ہوئے دل کا بیتابانہ طور پر باہر نکل آنا ہے۔ جب کوئی بندہ اس معنی میں دعا کرنے والا بن جائے تو اس کا پورا وجود دعا میں ڈھل جاتا ہے۔ دعا کے الفاظ اور اس کی ہستی الگ الگ نہیں رہتے۔ وہ اندر سے بھی وہی ہوتا ہے جو بظاہر دعا میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی دعا جس طرح خدا کے سامنے اس کے سوال کا مظہر ہوتی ہے اسی طرح وہ بندوں کے مقابلہ میں اس کے کردار کو بتاتی ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت ہے جو خدا کے سامنے تضرع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور بندوں کے مقابلہ میں تواضع اور عدم استکبار کی صورت میں۔

ذمہ دار کون

۱۔ ایک شخص حقہ پی رہا تھا۔ اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر"۔ اس کی چھوٹی لڑکی نے پوچھا: یہ مسجد کے ملاجی کیا کہہ رہے ہیں۔ "تم سمجھی نہیں"، باپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا "وہ کہہ رہے ہیں، اللہ حقہ بھر، اللہ حقہ بھر"۔

۲۔ ایک سیاح دہلی کی جامع مسجد دیکھنے آیا۔ وہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا کہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر"۔ سیاح نے گیٹ پر کھڑے ہوئے ایک مسلمان سے کہا: "میاں جی! مسجد تو شاہجہاں نے بنوائی ہے۔ یہ اکبر کا نام کیوں لے رہے ہیں؟"

اس قسم کی باتیں خواہ مسخرہ پن کے طور پر کہی گئی ہوں یا سنجیدگی سے، ہر حال میں وہ ہماری ذمہ داری کو بڑھاتی ہیں۔ کہنے والے نے یہ بات اگر سنجیدگی سے کہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابھی اپنی پڑوسی قوموں کو اسلام سے آگاہ نہیں کیا۔ اور اگر انھوں نے تمسخر کے طور پر یہ بات کہی ہو تب بھی ہم ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ کیوں کہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل اسلام کی عظمت لوگوں کے دلوں پر قائم نہیں۔ اگر ہم اپنے حالات اور اپنی زندگیوں سے اپنی عظمت لوگوں کے اوپر قائم کر چکے ہوں تو کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ ہمارے دین کے بارے میں اس قسم کے الفاظ اپنی زبان سے نکالے ——— پچھلے ہزار سال کی تاریخ اس کی گواہی دینے کے لئے کافی ہے۔

دین کی کوئی تشریح لفظوں ہی میں کی جا سکتی ہے۔ مگر انسانی الفاظ دین کی حقیقت کو بتانے کے لئے اسی طرح ناکافی ہیں جس طرح پھول کی حقیقت کو بتانے کے لئے یہ جملہ کہ: "پھول ایک رنگین اور خوش بودار چیز ہے"، گلاب کا درخت ساری کائنات سے غذائے کر رنگ اور خوشبو اور لطافت کے جس حسین مجموعہ کو اپنی ٹہنی پر کھلاتا ہے، اس کو وہ شخص تو کچھ سمجھ سکتا ہے جو اس کو سونگھ رہا ہو اور دیکھ رہا ہو۔ مگر جس آدمی کے سامنے صرف مذکورہ بالا الفاظ ہوں وہ نہیں جان سکتا کہ گلاب کا پھول حقیقۃً کس چیز کا نام ہے۔

آپ فقہ کی کتاب میں نماز کا باب پڑھیں تو آپ کو نماز کے بارے میں ساری تفصیلات لکھی ہوئی مل جائیں گی۔ مگر کتاب کے الفاظ کے ذریعہ آپ جس نماز سے واقف ہوں گے، وہ بعض حرکات کا محض ایک خشک ڈھانچہ ہوگا۔ لیکن یہی نماز جب ایک بندۂ مومن کی زندگی میں ڈھلتی ہے تو وہ لذتوں اور کیفیتوں کی ایک اتھاہ کائنات بن جاتی ہے۔

یہی پورے دین کا معاملہ ہے۔ دین کو "جاننے" کے لئے الفاظ کا مطالعہ کافی ہو سکتا ہے۔ مگر دین کو "پانے" کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس "مقام" پر پہنچائے جہاں پہنچ کر آدمی اس کو دیکھنے اور سونگھنے لگتا ہے ——— آدمی اپنے آپ کو کسی تحفظ کے بغیر خدا کے حوالے کر دے۔ وہ دنیا میں سانس لینے کے بجائے آخرت میں سانس لینے لگے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر فطرت اللہ کی حالت کو پہنچ جائے۔ وہ دین کو اپنی زندگی کا ضمیمہ بنانے کے بجائے اس کو اپنا سب کچھ بنا چکا ہو۔ اس کے بعد ہی کوئی شخص صحیح معنوں میں دین سے آشنا ہو سکتا ہے۔

---- چاہتے کہ جو کام نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو (آل عمران ۱۸۸)

ایک بستی ہے جہاں کسی کو دوسرے سے شکایت نہیں۔ ایک کے ذہن میں دوسرے کے خلاف تلخ یادیں نہیں۔ ایسی بستی میں ایک عام آدمی بھی اخلاق اور انسانیت کی باتیں کرسکتا ہے۔ مگر ایک ایسی بستی جہاں لوگوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہوں۔ جہاں دلوں میں یہ احساس چھپا ہوا ہو کہ ان کے پڑوسی نے ان پر زیادتیاں کی ہیں۔ ایسی بستی میں اخلاق اور انسانیت کا وعظ ایک غیر معمولی کام کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں کوئی ایسا شخص ہی وعظ کہنے کا حق رکھتا ہے جو اخلاق کے اس بلند مرتبہ پر ہو کہ شکایتوں کے باوجود اپنے پڑوسی کو دوست رکھے۔ دل پر چوٹ لگنے کے بعد بھی چوٹ لگانے والے سے بیزار نہ ہوتا ہو۔ اس پر زیادتیاں کی جائیں مگر وہ زیادتیوں کو بھول کر اخلاق اور انسانیت کا پیکر بنا رہے۔ جو شخص ان بلند اوصاف کا حامل نہ ہو اس کا مذکورہ بستی میں اخلاق اور انسانیت کا وعظ کہنا ایک بے فائدہ حرکت ہے۔ ان وعظوں میں جو وقت اور پیسہ خرچ کیا جائے وہ سب وقت اور پیسہ کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ آدمی کسی دوسرے کو ایسے اخلاق کی تلقین کیسے کرسکتا ہے جس پر وہ خود قائم نہ ہو۔ اور اگر کوئی جوشِ قیادت میں ایسا کرے تو اس کی تلقین کی قیمت کیا ہوگی۔

اس مثال میں ہم کو اس سوال کا جواب مل رہا ہے کہ بے شمار کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں ظالمانہ صورت حال کی اصلاح کیوں نہیں ہوتی۔ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے ہمارے یہاں انسانی برادری، امن کانفرنس، پیام انسانیت جیسے ناموں سے مختلف تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ دورے کئے جاتے ہیں۔ تقریریں اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ مگر ابتدائی دھوم کے بعد جلد ہی یہ تحریکیں اس طرح ختم ہوجاتی ہیں جیسے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں واعظ بننے کے لئے غیر معمولی اخلاقیات والے مصلح درکار ہیں۔ جب کہ ہمارے رہنما صرف معمولی اخلاقیات کا سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ قوم اپنے دائرہ اختیار میں "دوستی کے بدلے دوستی، دشمنی کے بدلے دشمنی" کے جس اصول کو اپنائے ہوئے ہیں، ہمارے رہنما بھی اپنے دائرہ اختیار میں اسی اصول پر چل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دوسروں سے یہ کہنا کہ "دشمنی کے بدلے دوستی"، کا اصول اپناؤ، خودرا فضیحت دیگراں را نصیحت کا مصداق ہے۔ اس قسم کا وعظ ایک قسم کا مسخرہ پن ہے نہ کہ حقیقۃً وعظ و نصیحت۔

انسانیت اور اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس کی طرف سے شکایت کا کوئی سبب پیدا نہ ہوا ہو اس کے ساتھ اخلاق اور انسانیت برتنا۔ یہ معمولی اخلاقیات ہیں۔ دوسرے یہ کہ شکایت اور تلخی پیدا ہونے کے بعد اخلاق اور انسانیت کا معاملہ کرنا۔ اس کو غیر معمولی اخلاقیات کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے رہنما بلاشبہ معمولی اخلاقیات کے حامل ہیں۔ مگر ہمارے جغرافیہ کا جو مسئلہ ہے وہ غیر معمولی اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس دوسرے معاملہ میں ہمارے رہنما صفر کی حد تک خالی ہیں" انسانیت" کے پرچار کا کام اگر وہ کسی ایسے جغرافیہ میں کر رہے ہوتے جہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایات پیدا نہ ہوئی ہوں تو ان پر کسی کو اعتراض کا حق نہ تھا۔ کیوں کہ یہ اخلاق کی

وہ سطح ہے جس پر وہ خود بھی قائم ہیں۔ جو لوگ ان کے ساتھ اچھے بنے ہوئے ہوں وہ بھی ان کے ساتھ اچھے بنے رہتے ہیں۔ مگر جب معاملہ ایسے لوگوں کا ہو جو ان کے ساتھ برا سلوک کریں جو ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائیں۔ جو ان کی انا کی راہ میں حائل ہوں تو ان کو ہمارے رہنما کبھی بخشنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر، اس معاملہ میں وہ خود بھی اخلاق کی اسی سطح پر ہیں جہاں ان کا مخاطب سماج ہے۔ پھر جو لوگ خود معمولی اخلاقیات کی سطح پر ہوں وہ دوسروں کو غیر معمولی اخلاقیات کا وعظ کس طرح سنا سکتے ہیں۔ جس طرح ایک جھوٹا آدمی سچائی کا مبلغ نہیں بن سکتا اسی طرح معمولی اخلاقیات کے لوگ غیر معمولی اخلاقیات کا درس نہیں دے سکتے اور اگر وہ اس قسم کی جرأت کریں تو یہ ایک بے فائدہ لفظی نمائش ہوگی نہ کہ کوئی حقیقی جد وجہد۔

ہم کسی سادہ جزیرہ میں نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں بے شمار قسم کی تلخیاں پہلے سے لوگوں کے درمیان موجود ہیں۔ ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے تاریخی اور غیر تاریخی شکایات ہیں۔ مفادات کے اختلاف نے لوگوں کو بانٹ رکھا ہے۔ اعتقادی اور نظریاتی اختلافات لوگوں کے ذہنوں میں بسے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے کو برسر حق اور دوسرے کو برسر باطل سمجھتا ہے۔ کچھ لوگ دولت و اقتدار کے مقامات پر قابض ہیں اور کچھ لوگ اس سے محروم پڑے ہوئے ہیں۔ اختلاف مزاج اور اختلاف مفاد کے نتیجہ میں بار بار ایک دوسرے سے شکایت کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ حتی کہ اس صورت حال نے ایک کو دوسرے کا حریف بنا رکھا ہے۔ ایسے ماحول میں انسانیت اور اخلاق کی بات کرنا گویا لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ ——— اختلاف کے باوجود مل کر رہو۔ شکایات کے اسباب ہوتے ہوئے ایک دوسرے کا احترام کرو۔ اختیار و اقتدار کے باوجود اپنے کمزور بھائی کے آگے جھک جاؤ۔ کوئی تمہارے متعلق بری رائے رکھتا ہو تب بھی تم اس کے بارہ میں اچھی رائے رکھو۔ دوسرے کی طرف سے قابل نفرت رویہ ظاہر ہونے کے باوجود اپنی طرف سے محبت کا مظاہرہ کرو۔ دوسرے کو اپنا حریف جانتے ہوئے بھی اس کو اپنے گلے سے لگالو۔ اور یہ سب کچھ کسی نمائشی جلسہ میں وقتی طور پر نہیں، بلکہ انھیں بلند اخلاقیات کو اپنا مستقل رویہ بنالو۔

سجے ہوئے پنڈال میں الفاظ کا دریا بہانا نہایت آسان ہے۔ مگر عملی زندگی میں ان بلند اخلاقیات کو نبھانا اتنا ہی زیادہ دشوار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہی وہ بلند اخلاقیات ہیں جن پر کوئی صالح اور صحت مند سماج قائم ہوتا ہے۔ مگر ایسے سماج کی تعمیر کے داعی وہی لوگ بن سکتے ہیں جو خود بھی ان غیر معمولی اخلاقیات کے حامل ہوں۔ معمولی اخلاقیات کا سرمایہ رکھنے والے لوگ اس تعمیری مہم کو نہیں چلا سکتے۔ جہاں تک ہمارے رہنماؤں کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں صفر کی حد تک خالی ہیں۔ رہنماؤں کی طویل فہرست میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا رہنما نہیں ہے جو اخلاق و انسانیت کی اس بلند سطح پر ہو۔ جو اپنے مخالف سے پیار کرتا ہو۔ جو اقتدار کا مالک ہونے کے باوجود اپنے کمزور حریف کے ساتھ مسکینی کا رویہ اختیار کرے۔ جو تلخی اور اشتعال کے اسباب ہوتے ہوئے بھی جذبات کا شکار نہ ہو ——— جو اپنے ماتحت ادارہ میں بلند اخلاقیات کا وہی ماحول قائم کئے ہوئے ہو جس کی طرف وہ تمام اہل ملک کو بلا رہا ہے۔ پھر آدمی خود عمل کی جس سطح پر نہ ہو، وہ محض تقریروں اور تجویزوں کے ذریعہ دوسروں کو وہاں کس طرح لا سکتا ہے۔

لفظی کمالات کی کوئی بھی مقدار عمل کوتاہی کا بدل نہیں بن سکتی ۔ اگر آپ خود معمولی اخلاقیات کی سطح پر ہوں تو محض الفاظ کے زور سے دوسروں کو غیر معمولی اخلاقیات کی سطح پر نہیں لاسکتے ۔ اس قسم کی تقریری مہم صرف ایک مسخرہ پن ہے اور مسخرہ پن نے کبھی اس زمین پر کوئی تاریخ نہیں بنائی ہے ۔

جو چیز لوگوں کے درمیان فساد یا بگاڑ پیدا کرتی ہے وہ معمولی حالات نہیں ہیں بلکہ غیر معمولی حالات ہیں ۔ عام حالات میں لوگ ہمیشہ ٹھیک ہی رہتے ہیں ۔ مگر اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے مواقع آتے ہیں جب کسی کو کسی سے تکلیف پہنچ جائے ۔ بس یہیں سے فساد شروع ہو جاتا ہے ۔ ٹھیس پہنچتے ہی آدمی کے اندر کا شیطان جاگ اٹھتا ہے ۔ وہ غصہ اور نفرت میں اندھا ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنے حریف کے خلاف کر سکتا ہے کر گزرے ۔

ہر آدمی کے اندر ایک سانپ ہے ۔ عام حالات میں وہ سویا ہوا ہوتا ہے ۔ مگر وہ اس وقت جاگ اٹھتا ہے جب اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جائے ۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صبر اور اللہ کا خوف ہے ۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملہ میں قوم افلاس کے جس مقام پر ہے ٹھیک وہی حال خود ہمارے واعظوں اور رہناؤں کا بھی ہے ۔ آپ کسی رہنما کے ساتھ نیازمندی دکھائیے ، اس کی قبائے عظمت کا تکمہ بنے رہئے تو وہ آپ سے خوش رہے گا ۔ لیکن اگر آپ اس پر تنقید کریں ، اس کی برتری کو مجروح کرنے کی کوشش کریں تو اچانک آپ دیکھیں گے کہ اس کے اندر کا سانپ جاگ اٹھا ہے ۔ اس کے بعد کم از کم آپ کے مقابلہ میں وہ اپنا انسانی لبادہ اتار پھینکے گا ۔ اگر آپ اس کے ادارہ میں ہیں تو آپ کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیا جائے گا ۔ آپ کے دوستوں اور ملاقاتیوں تک کی بے عزتی کی جائے گی ۔ رہنما کے زیر اثر پریس کے لئے آپ ایک بالکل بے قیمت انسان بن جائیں گے ۔ آپ کو نقصان پہنچانا عین جائز قرار پائے گا ۔ ایک ایسے بے دین شخص کا استقبال وہ پسند کرے گا جس سے اس کی امیج میں اضافہ ہوتا ہو ۔ مگر آپ سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرنا بھی اس کو گوارا نہ ہوگا ۔ اس کی نظر میں آپ کے علم و تقویٰ کی کوئی قیمت نہ ہوگی ۔ اس کے برعکس بے دین لوگ اس کے لئے قیمت والے ہوں گے ۔ کیوں کہ وہ اس کی شان میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں ۔

قوم کا اگر یہ حال ہے کہ وہ عام حالات میں ٹھیک رہتی ہے اور جب کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو بپھر کر فساد کرنے لگتی ہے تو ہمارے رہنما بھی اپنے دائرہ میں اسی کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔ پھر وہ قوم کے اوپر انسانیت اور اخلاق کے واعظ کس طرح بن سکتے ہیں ۔ "ایک سونے والا دوسرے سونے والے کو کیوں کر جگا سکتا ہے" جو لوگ اپنے نیازمندوں کے لئے شریف ہوں اور اپنے مخالفین کے لئے سانپ بنے ہوئے ہوں وہ دوسروں سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تم اپنے مخالفین کے لئے سانپ نہ بنو بلکہ ان کے ساتھ انسانیت اور اخلاق کا وہی برتاؤ کرو جو تم اپنے دوستوں کے ساتھ کرتے ہو ۔ خود معمولی اخلاق کی سطح پر ہونا اور دوسروں کو غیر معمولی اخلاق کا وعظ سنانا ، ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا ہے جس کو آدمی نے کیا نہیں (آل عمران ۱۸۸) اس قسم کی روش خدا کے غضب کو بھڑکانے والی ہے نہ کہ وہ اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں کو نازل کرنے کا سبب بنے ۔

زمین بنانے سے پہلے کھیتی نہیں ہوتی

"ہم اپنے ملک میں غیر سودی بنک کاری کا تجربہ کرنے جا رہے ہیں"، مہمان نے فخریہ لہجہ میں کہا۔
"موجودہ حالات میں یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا"، میں نے کہا۔
"کیوں"
"سودی بنک کاری کی زمین خود غرضانہ سماج ہے اور غیر سودی بنک کاری کی زمین بے غرضانہ سماج۔ آپ کے ملک کا موجودہ سماج ایک خود غرضانہ سماج ہے۔ پھر ایسے سماج میں کوئی ایسی اقتصادی اسکیم کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے جس کے لئے بے غرضانہ سماج کی زمین درکار ہوتی ہے"
"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ غیر سودی بنک کاری کے خلاف ہیں"
"نہیں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ اگر آپ غیر سودی بنک کاری کا نظام وجود میں لانا چاہتے ہیں تو اس کا آغاز بے غرضانہ سماج وجود میں لانے سے کیجئے۔ ابتدائی زمین تیار کرنے سے پہلے پیغمبر نے بھی غیر سودی معاشیات قائم کرنے کا حکم نہیں دیا۔ پھر آپ اس قسم کے منصوبہ میں کیوں کر کامیاب ہو سکتے ہیں (۹ نومبر ۱۹۷۸)

مستشرق کی زبان سے

پروفیسر مارگولیتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت نقاد تھے، مگر وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے) اڑنے والے جانوروں پر نشانہ بازی کی مشق کو منع فرمایا۔ جو لوگ اونٹوں پر ظلم کرتے تھے ان کے خلاف سخت ناراضگی ظاہر کی، جب ان کے بعض تبعین نے چیونٹیوں کی ایک چھوٹی سی پہاڑی میں آگ لگا دی تو ان کو حکم دیا کہ وہ اس کو بجھا دیں۔ ان کے زمانے سے کوئی عرب بھی اونٹوں کو اپنے اعزہ کی قبروں پر نہیں باندھتا کہ ایسا نہ ہو وہ بھوک اور پیاس سے مر جائیں، کوئی شخص بھی اپنی بھیڑ بکریوں کی آنکھیں اس لئے نہیں پھوڑتا کہ وہ خود نظر بد کے اثر سے بچ جائے۔ کوئی جلتی ہوئی مشعل باندھ کر جانوروں کے گلوں میں نہیں چھوڑ دیتا، کوئی بھی گھوڑوں کے چہروں پر ضرب نہیں لگاتا، نہ ان کے ایال اور دم تراشتا ہے، اس لئے کہ دم سے وہ مکھیاں اڑاتے ہیں اور ایال ان کو گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں۔ کوئی بھی گدھوں کے چہروں کو نہیں داغتا، نہ ان پر ضرب لگاتا ہے۔ اونٹوں اور مرغیوں کو گالیاں دینا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے یہ قسم کھائی کہ اگر اس کا اونٹ اس کو صحیح و سلامت اس کی منزل مقصود تک پہنچا دے گا تو وہ اس کو قربان کر دے گی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا "یہ تو اس غریب جانور کی حسن خدمت کا عجیب و غریب انعام ہے اور اس عورت کو اپنی قسم کا تاوان ادا کرنے سے معاف کر دیا"

ایک اقتباس

مسٹر سلطان احمد پاکستان کی سیاسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ سن (کراچی) میں لکھتے ہیں:

The PNA has all the disadvantages of being in office for a brief while without real power. They could not refuse to join Gen. Zia in an effort to neutralise the PPP. But the country has come to that tragic point where it is easy to come to office but difficult to stay, easy te promise but impossible to deliver and easy to talk im ideological terms and hold forth grand visions but difficult to delineate them precisely and implemmnt them in detail.

The Times of India, 11.11.1978

پاکستان قومی اتحاد حقیقی اقتدار کے بغیر مختصر مدت کے لئے وزارت قبول کرنے کے تمام ناموافق پہلوؤں سے دوچار ہے۔ وہ جنرل ضیاء الحق کی پیش کش کو اس لئے رد نہ کر سکے کہ وہ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ذریعہ وہ بھٹو پارٹی کو ختم کر دیں گے۔ مگر ملک ایسے دردناک نقطہ پر پہنچ گیا ہے کہ اب پاکستان میں وزیر بننا آسان ہے مگر برقرار رہنا مشکل ہے۔ وعدہ کرنا آسان ہے مگر اس کو زیر عمل لانا ناممکن ہے۔ نظریاتی اصطلاحوں میں بولنا اور بڑے بڑے خواب دیکھنا آسان ہے مگر ان کا ٹھیک ٹھیک نقشہ بنانا اور پوری طرح ان کی تعمیل کرنا مشکل ہے ■

زندہ لوگ

چینی کمیونسٹ پارٹی کے چیرمین اور وزیر اعظم مسٹر ہوا کوفنگ کا چھوٹا لڑکا ۱۹۷۷ میں کالج کے داخلہ کے ایک قومی امتحان میں فیل ہوگیا۔ داخلہ کے لئے جتنے نمبر مقرر کئے گئے تھے، وزیر اعظم کے لڑکے کا نمبر اس معیار سے کم تھا۔ اس لئے اس کا انتخاب نہ ہو سکا۔ بعد کو وزیر اعظم ہوا کہ کچھ آدمیوں نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا اور چاہا کہ وزیر اعظم اس مسئلہ کو دوبارہ زیر غور لائیں اور خصوصی اختیارات سے کام لے کر لڑکے کو داخلہ دلوادیں۔ مگر وزیر اعظم نے اس معاملہ میں دخل دینے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اگلے سال تم زیادہ سخت محنت کرو تاکہ تم کو زیادہ نمبر ملیں اور قاعدہ کے مطابق تمھارا داخلہ ہو سکے۔ (ہندستان ٹائمس ۷ اکتوبر ۱۹۷۸)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

پیغمبر اسلام

از: مولانا وحید الدین خاں

یہ کتاب سیرت سے متعلق مصنف کے مطالعہ کا خلاصہ ہے۔ مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ شجرۂ نبوت۔
۲۔ سیرت نبوی قرآن میں۔
۳۔ اثبات رسالت۔
۴۔ نبوت محمدی کا ظہور۔
۵۔ پیغمبر اسلام: مثالی انسانی کردار۔
۶۔ اسوۂ نبوت
۷۔ مکتوب نبوی بنام منذر بن ساوی
۸۔ اسلامی تحریک سیرت کی روشنی میں
۹۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین
۱۰۔ ختم نبوت: انسانیت پر عظیم احسان
۱۱۔ کلام نبوت
۱۲۔ نقشہ عالم اسلام

کتاب تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

بامقصد زندگی

(جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے ایک اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۹۶۳ء)

دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم بامقصد لوگ ہیں۔ کیوں کہ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بامقصد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مقصدی تصور آپ کے ذہن میں پایا جارہا ہو۔ کچھ تقریروں کو سن کر یا کچھ تحریروں کو دیکھ کر ایک مقصدی نظریہ کسی کے دماغ میں پہونچ جائے تو صرف اس بنا پر اسکو بامقصد انسان نہیں کہا جاسکتا۔ بامقصد انسان تو وہی ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ بامقصد بن گیا ہو۔ جس کی زندگی اسکے مقصد میں اس طرح ڈھل جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

آپ اس وقت ایک مسجد میں بیٹھے ہیں جس کے اوپر اونچے اونچے مینار کھڑے ہیں اگر ہوا کے ذریعے کچھ آم کے پتے اڑکر آئیں اور ان میناروں پر اٹک جائیں تو اس بنا پر ان میناروں کو آپ آم کا درخت نہیں کہنے لگیں گے۔ آم کا درخت تو وہی ہے جو اپنی جڑ میں بھی آم ہو، اپنے تنہ میں بھی آم ہو، اپنی شاخوں میں بھی آم ہو، اپنے پتوں میں بھی آم ہو، اور وہ آم ہی کے پھل دے۔ آم کا درخت آپ اسی کو کہتے ہیں جو اس طرح اوپر سے نیچے تک آم ہو۔ محض کسی لمبی کھڑی ہوئی چیز پر آم سے مشابہت رکھنے والی کچھ چیزوں کا اتفاق سے جمع ہو جانا اس کو ہرگز آم نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح آپ کو بھی بامقصد انسان کا لقب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب آپ سر سے پاؤں تک اپنے پورے وجود میں بامقصد بن گئے ہوں۔ محض کچھ نظریات کا کہیں سے آکر آپ کے ذہن میں اٹک جانا آپ کو بامقصد نہیں بنا دیتا۔ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم اسی وقت مسلمان کہے جانے کے مستحق ہیں جب ہم نے واقعی ایک مقصد کی طرح اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہو۔

بامقصد انسان کی پہچان کیا ہے۔ اس کو درجنوں پیرایہ سے بیان کیا جاسکتا ہے اس وقت میں اسکی چند خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کرونگا۔

۱۔ بامقصد آدمی کی پہلی پہچان وہ ہے جس کو میں "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام فکری اور ذہنی قوتیں آپ کے مقصد میں مرکوز ہوجائیں۔ آپ کا سوچنا، آپ کا محبت کرنا، آپ کا نفرت کرنا، سب کچھ آپ کے مقصد کے ساتھ وابستہ ہوگئے ہوں۔ آپ کی کوئی چیز دوسری سمت بکھری ہوئی نہ ہو۔ جوتا بنانے والوں کے یہاں آپ نے دیکھا ہوگا، کام کرتے کرتے ان کے پاس بہت سی کیلیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ یہ کرتے ہیں کہ مقناطیس کا ایک ٹکڑا لے کر وہاں پھراتے ہیں جس سے تمام بکھری ہوئی کیلیں کھنچ کھنچ کر اس سے چمٹ جاتی ہیں۔ اور پھر وہ اٹھاکر اسے خانے میں رکھ لیتے ہیں۔ اس مثال میں اگر مقناطیس کی جگہ آپ اپنے مقصد کو رکھیں اور کیلوں کے بجائے اپنے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کا تصور کریں تو زندگی اور مقصد کے درمیان تعلق کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیس کے گرد لوہے کے ٹکڑے جس طرح ایک ایک کرکے اکٹھا ہوجاتے ہیں اور آس پاس کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہوتا جو اس سے آکر چمٹ نہ گیا ہو، اسی طرح آدمی کے مقصد کے گرد اس کے سارے دل اور سارے دماغ کو مرکوز ہوجانا چاہیے۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے یہاں آئے ان کو بازار کا کچھ کام تھا۔ بازار جاکر جب وہ لوٹے تو انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ واقعہ بہت چھوٹا سا ہے مگر اس میں ہمارے لئے بڑی نصیحت ہے، انھوں نے کہا کہ میں ایک جگہ پہونچا جہاں سڑک کے کنارے بہت سے موچی اپنی اپنی دوکان لئے بیٹھے تھے۔ جب میں انکے پاس سے گذرا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص میرے جوتے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جس موچی کی نظر اٹھتی ہے وہ بس میرے جوتے پر آکر رک جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ موچی بھی اپنے مقصد میں کس قدر گم ہیں۔ ان کو انسان صرف جوتے کی شکل میں نظر آتا ہے بھرے ہوئے بازار میں سینکڑوں انسان ان کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ مگر انھیں ان انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو نظر اٹھاکر دیکھتے بھی نہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ آنے جانے والے لوگ اپنے پاؤں میں ایک ایسی چیز پہنے ہوئے ہیں جس کی پالش کرکے یا جس کی مرمت کرکے وہ کچھ پیسے حاصل کرسکتے ہیں۔ گویا انسان ان کی نظر میں صرف ایک "جوتا" ہے اور بس۔

اسی طرح بامقصد آدمی اپنے مقصد میں گم رہتا ہے۔ اس کو ہر چیز میں صرف اپنا مقصد نظر آتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر مسئلہ کو، ہر بات کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد کے تصور میں اتنا محو ہوجاتا ہے کہ دوسری چیزیں اسے بھولنے لگتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو بہت فعال آدمی ہیں جو کام بھی کرتے ہیں اس کو پوری طرح لگ کر کرتے ہیں ایک مرتبہ

میں ایک ایسے زمانے میں ان سے ملنے گیا جب وہ اپنا نیا مکان بنوانے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پائجامہ میں ایک جگہ بہت سے لال لال دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھ کر کہا، مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اس کے بعد انھوں نے پائجامہ اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹانگ میں ایک جگہ چوٹ لگ گئی ہے۔ چوٹ لگ کر خون بہا، کپڑے میں لگا، پھر خود بخود سوکھ کر بند ہو گیا۔ اور انھیں مطلق خبر نہیں ہوئی۔ جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ اسی طرح اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک اور ہی دنیا میں پہونچ جاتا ہے جہاں دوسری چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاں دوسری چیزیں اسے محسوس نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے جسمانی تقاضے بھی بعض اوقات اسے یاد نہیں رہتے۔

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بامقصد آدمی وہی ہے جس کو اپنے مقصد میں اس درجہ شغف اور انہماک ہو جائے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو بامقصد آدمیوں کی فہرست میں لکھنا، مقصد کے لفظ سے ایک طرح کا مذاق کرنا ہے۔

۲۔ بامقصد آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے مطابق زندگی گذارتا ہو۔ "مقصد کے مطابق عمل" سے میں ایک خاص چیز مراد لے رہا ہوں جس کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب ہیں جو ایک دیہات میں دوا علاج کا کام کرتے ہیں وہ کوئی سند یافتہ طبیب نہیں ہیں نہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بس لوگوں کی صحبت اور تجربہ کی وجہ سے کچھ باتیں جان گئے ہیں اور اس کے مطابق کام کر رہے ہیں بلکہ اپنی محنت اور توجہ کی وجہ سے اپنے علاقہ میں اچھے خاصے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ انکے گھر پر کچھ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میں کھیتی کے موٹے کام مثلاً کھودنا، ہل چلانا وغیرہ اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ آپ سمجھیں گے: وہ شاید کوئی شیروانی پوش آدمی ہونگے اور اپنی شیروانی کی عزت رکھنے کے لئے ایسے کاموں سے بچتے ہوں گے۔ مگر ان کو "شیروانی" اور "پتلون" کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے دیہاتی حکیم ہیں۔ کھیتی کے سخت کاموں سے الگ رہنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ اگر میں اس طرح کے کام کروں تو میرا ہاتھ سخت ہو جائے گا۔ انگلیوں کی کھال موٹی ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کی نبض میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکوں گا۔ نبض کی ضربیں ہلکی ہوتی ہیں اور ان میں بہت نازک اور لطیف فرق ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لئے انگلیوں کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر انگلیاں ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے سخت ہو جائیں، جیسا کہ اس طرح کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہیں، تو وہ نبض کی ضربیں محسوس کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔

ہر مقصد اپنے اختیار کرنے والے سے اسی کا تقاضہ کرتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مقصد کو

اپنائے، ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی اور اپنی روزانہ کی سرگرمیوں کو اپنے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ رکھے۔ وہ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دے۔ بامقصد آدمی ایک باشعور آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقۃً ایک مقصد اترا ہوا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے عملی حالات اور ایسے مشاغل کی طرف نہ لے جائے جہاں وہ اور اس کا مقصد الگ الگ ہو جائیں۔ جب وہ ویسا بن کر نہ رہ سکے جیسا اپنے مقصد کے اعتبار سے اسے بن کر رہنا چاہیے۔

میں ایک ایسے مسلم خاندان کو جانتا ہوں جس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ معقول طریقہ سے ایک سادہ زندگی گذار رہا تھا اور اسی کے ساتھ دین کے تقاضے بھی پورے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ اس کے مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شادی کو اس طرح کرے کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر میں معمول کے مطابق جو زندگی چل رہی ہے اس میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مگر اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ شادی کے لئے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جس کا معیار زندگی اسکے مقابلے میں بڑھا ہوا تھا۔ پھر شادی بھی اس طرح کی جیسے عام دنیا دار لوگ اپنی شادیاں کرتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کے گھر کا سارا سرمایہ شادی میں لگ گیا بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کا سارا کاروبار اجڑ گیا۔ اگر صرف اتنا ہی نقصان ہوا ہوتا جب بھی غنیمت تھا، کیوں کہ جس طرح مختلف قسم کے وقتی حادثے آدمی کے اوپر پڑتے ہیں اور پھر وہ سنبھل جاتا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ سنبھل جاتا۔ مگر شادی نے اس کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا۔ جس کا پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی لڑکی کو اس نے جو کپڑے اور سامان دیئے اور سسرال سے اس کے لئے جو کپڑے وغیرہ آئے، اس کی وجہ سے شادی شدہ لڑکی کی پوشش اور رہن سہن کا معیار یکایک بہت بڑھ گیا۔ اور جب گھر کی ایک لڑکی کا معیار بڑھا تو اسی کیساتھ دوسروں کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ پھر اسی کے ساتھ نئے فرنیچر سے لدی ہوئی پوری ایک گاڑی بھی اس کے گھر اتری ان چیزوں کے نتیجہ میں اس کی گھریلو زندگی کا معیار بالکل مصنوعی طور پر یکایک بدل گیا۔ اب ہر چیز میں پہلے سے زیادہ خرچ ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف پچھلے قرضوں کی ادائگی اور دوسری طرف بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کرنا، ایسے دو پاٹ بن گئے جن کے نیچے اس کی زندگی پس کر رہ گئی، اس کا گھر دیکھتے دیکھتے ایک دیندار گھرانے سے ایک دنیا دار گھرانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے دنیوی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بالآخر وہ انھیں گھسیٹ کر تباہی کے غار میں پہونچا دیتا

ہے۔ جو شخص کسی مقصد کے لئے دنیا میں جینا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ باشعور زندگی گذارے۔ وہ اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس مادی دنیا میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ آدمی ایسے بندھنوں میں اپنے آپ کو پھنسا لے جس کے بعد وہ بہ ظاہر زندہ نظر آتا ہو، مگر مقصد کے اعتبار سے اس نے خودکشی کر لی ہو۔ دنیا کی نمائشی چیزوں میں دلچسپی مادی سازوسامان کی کثرت، سطحی مشاغل میں پڑنا، غیر ضروری عادتوں میں اپنے کو ڈالنا، پست لٹریچر کا مطالعہ ـــ یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مقصد سے دور کر دیتی ہیں، اس کے وقت کو غیر ضروری مشغولیتوں میں لگا دیتی ہیں، اس کے جذبات و احساسات کو مقصد کے بارے میں کمزور کر کے دوسری چیزوں کے بارے میں شدید کر دیتی ہیں۔ اس کو ایسے تعلقات اور ایسے تقاضوں میں الجھا دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود دوسری طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو اسلام عزیز ہے اور آپ اس کو اپنا مقصد بنا کر اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ اپنی عملی زندگی، اپنے تعلقات اور اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کو اس سے ہم آہنگ رکھیں، آپ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دیں۔ اس معاملے میں آپ کو اس ہوشیار طبیب کی طرح بن جانا چاہیے جو اپنی انگلیوں تک کی اس حیثیت سے حفاظت کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوں کہ وہ نبض دیکھنے کی صلاحیت کو کھو دیں پھر ایک مسلمان کا مقصد اس سے زیادہ نازک اور اس سے زیادہ مشکل ہے، اس لئے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات پر نظر رکھنی چاہیے۔

۳۔ تیسری چیز با مقصد آدمی کو پہچاننے کی یہ ہے کہ اس کے عمل میں مقصد کی روح موجود ہو۔ یہاں "عمل" سے میری مراد عام عمل نہیں ہے، بلکہ وہ عمل ہے جو مقصد کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں۔ مقصد سے متعلق عمل بھی کبھی بے مقصد ہوتا ہے۔ بہ ظاہر آدمی مقصد کا سا عمل کر رہا ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس کے عمل کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک مثال لیجئے۔ ہمارے یہاں جو مذہبی فرقے ہیں ان کی ابتدا بھی اصلاً ایک مقصدی گروہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مخصوص مشن لے کر اٹھے تھے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آج وہ اپنی مقصدی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ وہ تحریک کے بجائے ایک جامد قسم کی روایتی انجمن بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مقصدی تصور ان کے ذہن سے نکل گیا، اور نہ ایسا ہے کہ مقصد کے لئے کام کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب چیزیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اب وہ اسپرٹ باقی نہیں رہی جو ایک مشن کے علم بردار کے اندر ہوتی ہے۔

اب ان کا مقصد محض ایک بحث و گفتگو کا موضوع ہے جس پر وہ کبھی آپس میں کبھی دوسروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ ان کے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ مگر ان رسالوں اور اخباروں کی حیثیت مقصدی پرچوں سے زیادہ کاروباری اداروں کی ہے۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان اجتماعات کی حیثیت کسی مقصدی سرگرمی کی نہیں۔ بلکہ وہ ماضی کی پڑی ہوئی ایک لکیر ہے جس پر وہ رسمی طور پر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے جماعتی فنڈ بھی ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ مگر یہ دینا زیادہ تر جماعتی تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت۔ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لئے دورے اور تقریریں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کسی مقصدی بے تابی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یا تو محض روایتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یا اسی قسم کے جذبے کے تحت ہوتا ہے جیسے کسی فرم کی پبلسٹی برانچ کا افسر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات پر کتابیں اور پمفلٹ چھاپتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ ایک بنے ہوئے حلقہ کی مانگ پوری کر دی جائے۔

وہ عمل جو حقیقۃً داعیانہ جذبے کے تحت نکلتا ہے اور وہ عمل جو روایتی طور پر یا محض ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کیا جاتا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا حقیقت کی نقل۔ ایک جگہ بات صرف حلق سے نکلتی ہے اور دوسری صورت میں آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی پوری شخصیت کو انڈیل دیا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کا عمل صرف ایک لگی بندھی کاروائی نظر آتا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا عمل اس کے بے تاب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کی تمام زندگی سراپا اس کے مقصد میں ڈوبی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں بعض مقصد نما اجزاء اس کی غیر متعلق زندگی کے ساتھ اس طرح ادھر اُدھر اٹکے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کسی مینار میں آم کے چند پتے۔

یہ خطرہ اس گروہ کو ہے جو ایک مقصد کو لیکر اٹھے اور اس پر اس کو پچیس پچاس سال گذر جائیں۔ لیکن یاد رکھئے کوئی گروہ اسی وقت تک مقصدی گروہ ہے جب تک حقیقۃً وہ مشنری اسپرٹ کے تحت کام کر رہا ہو۔ اس کے بعد جب اس کی گاڑی اس سے اتر کر روایتی ڈگر پر چل پڑے، جب اس کی سرگرمیاں بے تابانہ جذبات کے اظہار کے بجائے مقررہ کاروائی بن کر رہ جائیں، تو وہ تحریک کے بجائے رسم اور جماعت کے بجائے انجمن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ شکلاً وہ ایک بامقصد گروہ کے مانند نظر آتا ہے۔ مگر مقصدی حیثیت سے اب اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے۔

وہ بامقصد انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ سابقہ بامقصد انسان کی لاش ہوتی ہے جو دیکھنے میں سابقہ انسان کی طرح نظر آتی ہے، مگر حقیقۃً انسان نہیں ہوتی۔

اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کردوں گا۔ اس طرح کی باتیں جب کہی جاتی ہیں تو بعض لوگ جواب دیتے ہیں ——"آپ کی باتیں تو سب ٹھیک ہیں، ہم خود بھی اپنے اندر یہی چیز پیدا کرنا چاہتے ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیز کیسے پیدا ہو" یہ بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقۃً اس کے ذریعے سے اپنے الزام کو اپنے سے ہٹا کر اسے خارج کے اوپر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سوچئے کہ وہ خارج جس کے اوپر آپ اپنا الزام ڈالنا چاہتے ہیں وہ کون ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک خدا ——ہے۔ اسی نے ساری چیزوں کو بنایا ہے۔ اس لئے خارج کو الزام دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا اس ڈھنگ سے بنائی ہے کہ ہم وہاں اپنے ایمانی تقاضوں کو حاصل کرنا چاہیں تو حاصل نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا اس سے پاک ہے کہ اس پر یا اس کی تخلیق پر اس قسم کا الزام عائد ہوسکے۔ اس لئے خارج پر جب الزام ڈالا نہیں جاسکتا تو لامحالہ وہ آپ کی طرف لوٹے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اپنی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ فطرت اور حقیقت میں تضاد نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ ہم کو ایسا ہی بننا چاہیے تو لازماً ہماری فطرت اور کائنات کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہم ایسے بن سکیں۔

تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی مہم

آپ کو آواز دیتی ہے

وقتی جوش کے تحت بڑی قربانی دینا آسان ہے۔ مگر کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت تسلسل کے ساتھ دی جائیں۔ ہم اسی قسم کی ایک چھوٹی قربانی کے لئے آپ سے اپیل کررہے ہیں۔

وہ لوگ جو الرسالہ کو ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کی ایجنسی قبول کرکے اس فکری مہم میں ہماری مدد فرمائیں۔ پانچ پرچہ کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپے ہوتی ہے۔ ہمارا ہر ہمدرد یہ طے کرے کہ وہ پانچ پرچے ہر حال میں منگائے گا۔ اور جب تک خریدار مہیا نہ ہوں لوگوں میں مفت تقسیم کرے گا۔ اور اس وقت تک ساڑھے سات روپے ماہانہ اپنے پاس سے ادا کرتا رہے گا جب تک خریدار نہیں مل جاتے۔

موجودہ حالات میں ایک شخص کے لئے یہ بہت چھوٹی قربانی ہے۔ لیکن اگر ہمارا ہر ہمدرد اس قربانی کو اپنی زندگی میں شامل کرے تو چند سالوں میں انشاءاللہ بہت بڑے نتائج نکل سکتے ہیں۔

مولانا حمید اللہ ندوی بھوپال

یہ غوغائی سیاست

ماہ اکتوبر کے الرسالہ میں کشمیر میں میر سید علی ہمدانی کے کام کی نوعیت کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے واقعاتی انداز میں دعوت کا کام کرنے والوں کی جو رہنمائی فرمائی ہے، اس طرز پر جب بھی کام ہوا ہے، اسے کامیابی ملی ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے سامنے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک دوسری عظیم الشان مثال موجود ہے، وہ ہے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح کا کام —— اکبری گمراہی کو ختم کرنے کے لئے مجدد الف ثانی تاریخ اسلام کا سب سے بڑا میدان کربلا برپا کر سکتے تھے، لاکھوں افراد کو وہ اپنے جوش خطابت کے ذریعہ شہادت کے لئے آمادہ کر سکتے تھے، اور پھر بھی وہ اکبر کے سامنے ممکن ہے، اسی طرح ناکام رہتے، جس طرح حضرت حسین رض یزید کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ مجدد الف ثانی رح نے ہندستان کے ہر مکتبہ فکر کے علماء و خواص کو اکٹھا کر کے ایک مشترکہ آزمائش کو ختم کرنے کے لئے کوئی مجلس مشاورت بھی نہیں بنائی، نہ انھوں نے عوام کو ترک موالات پر ابھارا۔ وہ انتہائی دردمندی، خاموشی اور حکمت عملی کے ساتھ اس فتنہ کا انسداد کرنے کے لئے مثبت انداز میں کام کرنے کے وقت اور موقع کے منتظر رہے۔ خود اکبری عہد کو انھوں نے اپنے کام کا آغاز کرنے کے لئے موزوں نہیں پایا تو مرحوم نے قطعاً عجلت نہیں دکھائی، انھوں نے مکمل طور پر اس اصول پر بھی عمل کیا کہ بے وقت کا اقدام ناکامی کا سبب نہ بن جائے۔ انھوں نے جہانگیر کی جانشینی تک انتظار کیا۔ حالاں کہ ان کے لئے یہ انتظار سخت صبر آزما تھا۔ ظاہر ہے کہ جہانگیر اکبر کے نظریات کے سلسلہ میں اتنا حساس نہیں تھا۔ اس عرصہ میں مجدد صاحب رح نے یہ بھی سوچ لیا کہ بادشاہ پر کس طرح اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔ بادشاہ کے ذہن کو بدلنے کے لئے

ایک تجویز

میری ایک تجویز ہے جسے جناب پسند فرمائیں تو شائع بھی کر دیں، وہ یہ کہ الرسالہ کی اشاعت کا ہفتہ منایا جائے اور سال الرسالہ کے ہمدردوں سے اپیل کی جائے کہ اس ہفتہ اس کام کو ایک مہم کے طور پر کریں اور کم سے کم ہر خریدار، نئے تین خریدار بنائے، زیادہ جتنے بھی بن جائیں۔ یہ کام ایک تحریک کے طور سال میں ایک مرتبہ بھی ہو جائے تو ہر سال اشاعت میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے، اور یہ بات چل پڑے تو حیرت انگیز طور پر الرسالہ کی اشاعت پھیل سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو الرسالہ سے ایک تحریک کی طرح وابستہ ہوں گی، جتنے خریدار ہیں، ان کی اگر ایک ثلث تعداد نے بھی اس پر عمل کیا تو ایک مہم میں الرسالہ کی اشاعت دوگنی ہو جایا کرے گی، اور ہر آنے والا سال اشاعت کو سال گزشتہ کے مقابلہ میں دگنا کر دیا کرے گا۔ میں نے طے کیا ہے کہ میں الرسالہ کے لئے اور اس تحریک کے لئے ایسے لوگوں کے ذہن بناؤں جو سوسائٹی میں مؤثر حیثیت رکھتے ہوں اور قائم شدہ ایجنسی کے ساتھ تعاون کروں

(حمید اللہ ندوی۔ بھوپال)

ایک بڑا لشکر وہ کام نہیں کرسکتا جو کام بادشاہ کے معتمدین کرسکتے ہیں، اس لئے مجدد صاحب کی دانش مندی نے لشکر کی فراہمی میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ وزرائے سلطنت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ــــــ

مجدد صاحب کے مکتوبات جو وزراء کے نام ہیں انھیں دیکھ کر ہر ایک اندازہ لگا سکتا ہے، کہ کس دل سوزی حکمت عملی اور اپنائیت کے ساتھ مجدد صاحب نے مختلف عمائدین سلطنت کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور انھیں جہانگیر کا ذہن بدلنے کے لئے آمادہ کیا ــــــ ایک موقع مجدد صاحب کی تحریک کے لئے انتہائی آزمائش کا آگیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر مجدد صاحبؒ کی دانش مندی اور دور اندیشی اس موقع پر خطا کر جاتی تو مجدد صاحب اپنے مشن میں یقیناً فیل ہو چکے ہوتے ــــ یہ نازک وقت وہ تھا جب اصول پر سمجھوتہ نہ کرتے ہوئے مجدد صاحب نے جہانگیر کو سجدۂ تعظیمی نہیں کیا تھا اور اس نے آپ کو جیل بھیج دیا۔ ایسے موقع پر ہمارا آج کا داعی آسانی سے اپنے مریدوں کو ہڑتالوں اور احتجاجات کی راہ پر ڈال دیتا اور نتیجۃً سخت ٹکراؤ کی نوبت آتی اور دعوتی کام کا وہی حشر ہوتا جو آج ہمیں پاکستان کے داعیوں کی جدلی دعوت کا نظر آرہا ہے ــــ ایسا نہ کرتے ہوئے مجدد صاحب نے صبر وسکون کے ساتھ جیل کی زندگی گزاری اور اپنے مریدین کے جذبات کو قابو میں رکھا، اور اسی کے ساتھ وزرائے سلطنت سے مسلسل رابطہ قائم رکھتے ہوئے اپنے دعوتی کام سے یک لمحہ غافل نہیں ہوئے ــــــ مجدد صاحب کی اس خاموش حکیمانہ اور ہر قسم کی نعرہ بازی سے ہٹی ہوئی مثبت کوششوں کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ ہم جانتے ہیں

ــــ آج بھی یہ سب کچھ ہوسکتا ہے، بشرطیکہ ہم غوغائی سیاست کی چاشنیوں کو ترک کرنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کرلیں۔

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے کہ وہ پرچہ بذریعہ وی، پی طلب نہ فرمائیں۔ بلکہ اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں یہ طرفین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا شش ماہی زرتعاون بیک وقت ادا نہ کر سکیں، وہ ہر مہینہ دو روپے کا ٹکٹ لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ کر دیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں

ضروری اعلان

بینک میں ہمارا اکاؤنٹ "الرسالہ منتقل" کے
کے نام سے ہے۔ اس لئے بینک سے رقم
بھیجتے ہوئے چک یا ڈرافٹ پر الرسالہ منتقل
AL-RISALA MONTHLY
لکھیں۔ کوئی دوسرا لفظ (مثلاً صرف الرسالہ
یا منیجر الرسالہ وغیرہ) نہ لکھیں

حفاظت قرآن

قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اترا۔ سب سے پہلی آیت جو اتری وہ آیت علم (اقرأ باسم ربك الذی خلق) تھی اور آخری آیتِ آخرت (اتقوا یوما ترجعون فیه الی الله، بقرہ) ابتدائی ۲۳ سال تک خود رسول اللہ کی ذات قرآن کے اخذ کا ذریعہ تھی۔ اپنے بعد آپ نے کچھ لوگوں کو نامزد کر دیا کہ ان سے تم قرآن سیکھنا۔ یہ لوگ وہ تھے جنھوں نے نہایت صحت کے ساتھ پورے قرآن کو اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا تھا اور عربی زبان سے گہری واقفیت اور جناب رسول کی مسلسل صحبت کی وجہ سے اس قابل ہوگئے تھے کہ مستند طور پر قرآن کی تعلیم دے سکیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانے میں ایک شخص کوفہ سے مدینہ آیا۔ گفتگو کے دوران اس نے آپ سے کہا کہ کوفہ میں ایک شخص یاد سے قرآن پڑھاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر غضب ناک ہوگئے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ وہ بزرگ حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں، تو آپ خاموش ہوگئے (استیعاب، جلد ۱، صفحہ ۳۷۷) اس کی وجہ یہی تھی کہ عبداللہ بن مسعود آنحضرت کے اجازت یافتہ تھے۔ آپ کے مجاز قاریوں میں سے چند نمایاں افراد یہ تھے:— عثمان، علی، ابی ابن کعب، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابوالدرداء، ابوموسیٰ اشعری، سالم مولیٰ ابی حذیفہ۔

مگر یہ اجازت یافتہ افراد ہمیشہ نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ اندیشہ بہرحال تھا کہ کسی وقت ایسے تمام لوگ ختم ہو جائیں اور قرآن دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر اختلاف کا شکار ہو جائے۔ جنگ یمامہ (۱۲ھ) کے بارہ میں خبر آئی کہ کثرت سے مسلمان قتل ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر، خلیفہ اول ابوبکر صدیق کے پاس آئے اور کہا کہ اب قرآن کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ اس کو تحریری طور پر باضابطہ مدون کر دیا جائے۔ اس موقع پر روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

فلما قتل سالم، مولیٰ ابی حذیفة خشی عمر ان یذهب القرآن فجاء الی ابی بکر ۔ ۔ ۔

جب سالم، مولیٰ ابوحذیفہ قتل ہوئے تو عمر کو خطرہ پیدا ہوا کہ قرآن ضائع نہ ہو جائے، وہ ابوبکر کے پاس آئے،

فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۹

یمامہ کی جنگ میں تقریباً ۷۰۰ صحابہ قتل ہوئے تھے۔ مگر حضرت عمر کو "ذہاب قرآن" کا خطرہ حضرت سالم کی موت کی وجہ سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان چند مخصوص صحابہ میں سے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن کی اجازت دی تھی۔

جیسا کہ ثابت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے اترتے ہی اس کو فوراً لکھوا دیا کرتے تھے۔ کتابت کا اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ سورہ نساء آیت ۹۵ اتر چکی تھی بعد کو غیر اولی الضرر اس میں بطور اضافہ اترا۔ امام مالک کے الفاظ میں یہ "حرف واحد" (درمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۰۳) بھی آپ نے اسی وقت کاتب کو بلا کر لکھوایا:

لما نزلت لا یستوی القاعدون من المومنین

جب آیت لا یستوی القاعدون الخ اتری تو رسول اللہ

غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ، قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ادع لی زید ولیجیئ باللوح والقلم والکتف والدواۃ ثم قال اکتب لا یستوی ۔۔۔ (بخاری)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید کو بلاؤ اور وہ تختی اور قلم اور کتف اور دوات لے کر آئیں۔ جب وہ آ گئے تو کہا کہ لکھو لا یستوی ۔۔۔۔۔

آپ کا معمول تھا کہ نازل شدہ آیات کو لکھانے کے بعد اس کو پڑھوا کر سنتے۔ زید بن ثابت کا بیان ہے: فان کان فیہ سقط اقامہ (مجمع الزوائد، جلد ۱، صفحہ ۶۰) اگر کوئی جزء لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو درست کراتے جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا (ثم اخرج بہ الی الناس ۔۔۔) کاتبان وحی (وہ صحابہ جن سے آپ قرآن کو لکھواتے تھے) ان کی تعداد ۴۲ تک شمار کی گئی ہے۔ (ان ۴۲ کاتبوں کے نام کے لئے ملاحظہ ہو الکتانی کی کتاب التراتیب الاداریہ، جلد ۱، صفحہ ۱۶، مطبوعہ مراکش) ابن عبد البر نے عقد الفرید (جلد ۴، صفحہ ۱۱۴) میں لکھا ہے کہ حنظلہ ابن ربیع رض تمام کاتبوں کے "خلیفہ" تھے۔ یعنی ان کو حکم تھا کہ وہ ہر وقت آپ کی صحبت میں موجود رہیں۔ آپ کے اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو کثرت سے لوگوں کے پاس قرآن کے اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے۔ ایک تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے پاس مکمل قرآن اپنی اصل ترتیب کے ساتھ جمع شدہ موجود تھا۔ ان میں سے چار خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

مات نبی ولم یجمع القرآن غیر اربعۃ: ابو الدرداء ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت و ابو زید

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو چار آدمیوں کے پاس مکمل قرآن تحریری طور پر موجود تھا: ابو الدرداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید

قرآن مکمل طور پر لکھا ہوا عہد نبوت میں موجود تھا۔ البتہ کتابی شکل میں ایک جگہ مجلد نہیں ہوا تھا۔ قسطلانی شارح بخاری کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے:

قد کان القرآن کلہ مکتوبا فی عھدہ صلی اللہ علیہ وسلم لکن غیر مجموع فی موضع واحد (الکتانی، جلد ۲، صفحہ ۳۸۴)

قرآن کل کا کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ البتہ ایک جگہ تمام سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا۔

حارث محاسبی نے، جو امام حنبل کے معاصر ہیں، اپنی کتاب فہم السنن میں لکھا ہے:

وکان القرآن فیھا منتشرا فجمعھا جامع وربطھا بخیط

قرآن کی سورتیں اس میں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں۔ ابوبکر کے حکم سے جامع (زید بن ثابت) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگے سے سب کی شیرازہ بندی کی

قرآن کی کتابت تین مراحل سے گزری ہے: کتابت، تالیف، جمع۔

پہلے مرحلہ میں کوئی آیت یا سورۃ اترتے ہی اس کو کسی ٹکڑے پر لکھ لیا جاتا تھا، اس سلسلے میں حسب ذیل چیزوں کے نام آئے ہیں:

رقاع	چمڑا
لخاف	پتھر کی سفید پتلی تختیاں (سلیٹ)
کتف	اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی
عسیب	کھجور کی شاخ کی جڑ کا کشادہ حصہ

دوسرے مرحلہ کے عمل کو حدیث میں تالیف سے تعبیر کیا گیا ہے (کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نولف القرآن فی الرقاع، مستدرک حاکم) گویا اولاً ہر آیت نازل ہوتے ہی لکھ لی جاتی تھی۔ پھر جب سورہ مکمل ہو جاتی تو پوری سورہ کو مرتب شکل میں رقاع (چمڑے) پر لکھتے تھے۔ اس قسم کے مولفہ قرآن (مکمل یا غیر مکمل) دور نبوت ہی میں کثرت سے لوگوں کے پاس ہو چکے تھے۔ حضرت عمر کے اسلام لانے کے مشہور واقعہ میں ہے کہ بہن کو زدوکوب کرنے کے بعد آپ نے کہا وہ کتاب مجھے دکھاؤ جو ابھی تم پڑھ رہے تھے (اعطنی الصحیفۃ التی سمعتکم تقرؤن آنفا، ابن ہشام)۔ بہن نے جواب دیا: ناپاکی کے ساتھ تم اس کو چھو نہیں سکتے۔ پھر آپ نے غسل کیا اور ان کی بہن نے کتاب انھیں دی (فاغتسل فاعطتہ الصحیفۃ)

تیسرے مرحلہ کے کام کو "جمع" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی پورے قرآن کو ایک جلد میں یکجائی طور پر لکھنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مختلف رسالوں اور کتابوں کی شکل میں ہوتا تھا۔ تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرنے کا طریقہ آپ کے عہد میں رائج نہ تھا۔ بخاری کی ایک روایت کے مطابق صرف چار صحابہ (ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوزید، زید بن ثابت) تھے جنھوں نے پورے قرآن کو آپ کے عہد میں مجموعی شکل میں تیار کر لیا تھا۔ تاہم ان کی حیثیت نجی مجموعوں کی تھی۔ محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے کنزالعمال میں جو روایت ہے، اس کے مطابق ایسے جامعین قرآن کی تعداد پانچ تھی، (جمع القرآن فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمسۃ من الانصار) حضرت ابوبکر صدیق نے جو کام کیا وہ یہی تھا کہ انھوں نے ریاستی انتظام کے تحت تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر مجلد کرا دیا۔ امام مالک شہاب زہری سے اور شہاب زہری عبداللہ بن عمر کے صاحبزادہ سالم کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے القراطیس پر ابوبکر کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا۔ بعض محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے۔ ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر صدیق کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو ربعہ کہتے تھے (اتقان، جلد ۱، صفحہ ۸۵-۸۴) ربعہ کا ترجمہ چوکھنٹا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق کا طول وعرض اغلبا متساوی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں مصر، عراق، شام اور یمن وغیرہ میں قرآن کے ایک لاکھ سے زیادہ نسخے موجود تھے۔

بعد کے زمانے میں لکھا ہوا قرآن ہی لوگوں کے لئے قرآن کو سیکھنے کا ذریعہ بن سکتا تھا، تاہم ایک خطرہ اب بھی تھا۔ مقدس کتاب میں انتہائی معمولی فرق بھی زبردست اختلاف کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے یہ اندیشہ تھا کہ مختلف لوگ اگر اپنے اپنے طور پر قرآن لکھیں تو کتابت اور قرأت کا فرق مسلمانوں کے اندر زبردست اختلاف کھڑا کر دے گا اور اس کو ختم کرنے کی کوئی سبیل باقی نہ رہے گی۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں ایک ہی لفظ کو محض ادائگی کے فرق سے کوئی مالک یوم الدین لکھتا، کوئی ملک یوم الدین اور کوئی ملیک یوم الدین۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا، طرز تحریر اور رسم الخط کا فرق نئے نئے اختلاف پیدا کرتا چلا جاتا۔ اس لئے حضرت عمر کے مشورہ سے خلیفہ اول حضرت ابوبکر نے طے کیا کہ سرکاری اہتمام میں قرآن کا ایک مستند نسخہ لکھوا دیا جائے اور اختلاف قرأت کے امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

اس کے لئے زید بن ثابت سب سے زیادہ موزوں شخص تھے، کیونکہ وہ رسول اللہ کے کاتب (سکریٹری) تھے۔ زید اور ابی بن کعب دونوں "عرضۂ اخیرہ" میں شامل تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست پورے قرآن کو نبوی ترتیب کے ساتھ سنا تھا۔ ان کو پورا قرآن مکمل طور پر یاد تھا اور اس کے ساتھ پورا قرآن مرتب طور پر لکھا ہوا بھی ان کے پاس موجود تھا۔ خلیفۂ اول نے ان کو حکم دیا کہ تم قرآن کا تتبع کرو اور اس کو جمع کر دو (فتتبع القرآن فاجمعه، بخاری) اس بات کے طے ہونے کے بعد حضرت عمر نے مسجد میں اعلان کر دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی ٹکڑا موجود ہو، وہ لے آئے اور زید کے سامنے پیش کرے۔

خلیفہ اول کے زمانہ میں قرآن "کاغذ"، یعنی چمڑے، پتھر اور کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھا ہوا تو موجود تھا اور بہت سے لوگوں کے سینوں میں، رسول اللہ سے سن کر، مرتب طور پر بھی محفوظ تھا۔ مگر وہ ایک کتاب کی طرح بین الدفتین اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ خلیفہ اول نے حکم دیا کہ اس کو بین الدفتین جمع کر دو اور اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت میں یکجا کر دو:

وقال الحارث المحاسبی فی کتاب فهم السنن: کتابة القرآن لیست بمحدثة، فانه صلی اللہ علیه وسلم کان یامر بکتابته ولکنه کان مفرقا فی الرقاع والاکتاف والعسب فانما امر الصدیق بنسخها من مکان الی مکان مجتمعا وکان ذلك بمنزلة اوراق وجدت فی بیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیها منتشر فجمعها جامع وربطها بخیط حتی لا یضیع منها شئ

الاتقان، جلد ۱، صفحہ ۶۰

حارث محاسبی فہم السنن میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی کتابت کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لکھوایا کرتے تھے۔ مگر وہ رقاع اور اکتاف اور عسیب میں متفرق طور پر لکھا ہوا تھا۔ ابوبکر صدیق نے اس کو مرتب طور پر یکجا لکھنے کا حکم دیا۔ اور یہ بمنزلہ ان اوراق کے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پائے گئے تھے۔ ان میں قرآن منتشر طور پر لکھا ہوا تھا — اسی کو جمع کرنے والے نے جمع کر دیا اور ایک دھاگے میں اس طرح پرو دیا کہ اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو۔

عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے قرآن "جمع" نہ تھا اور آپ کے زمانۂ خلافت میں اس کو جمع کیا گیا۔ قرآن اس سے پہلے بھی مکمل طور پر جمع تھا۔ "عرضۂ اخیرہ" میں متعدد صحابہ کو شامل کر کے آپ نے اس کی تصدیق و توثیق بھی فرمادی تھی۔ جمع قرآن کا یہ اہتمام صرف اس لئے ہوا کہ معمولی امکانی فروق کو بھی باقی نہ رہنے دیا جائے جو حافظہ یا کتابت میں فرق کی وجہ سے ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عمر نے زید بن ثابت کو یہ آیت سنائی:

من المهاجرين والانصار الذين اتبعوهم باحسان (توبہ ۱۰۰)

زید نے کہا مجھے تو یہ آیت جس طرح یاد ہے، اس میں انصار اور الذین کے درمیان ایک "واو" بھی ہے۔ چنانچہ تحقیق شروع ہوئی بالآخر مختلف لوگوں کی گواہیوں سے ثابت ہوا کہ زید کی رائے صحیح تھی۔ چنانچہ مصحف میں آیت کو واؤ کے ساتھ لکھا گیا۔

مولانا بحرالعلوم شرح سلم میں لکھتے ہیں "قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس لئے کہ ان دس قاریوں نے جن کی قرأت اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہے، صحیح سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، قرآن کو اسی ترتیب سے نقل کیا۔

زید بن ثابت نے جب پورا قرآن مرتب کر لیا تو ان کے مصحف کے علاوہ جتنے مختلف اجزاء اکٹھا ہوئے تھے، ان سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔ یہ مجلد مصحف خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے پاس رکھ دیا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر کے پاس رہا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد وہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ رہا۔

حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ آیا تو اسلام بہت پھیل چکا تھا اور مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے لئے قرآن سیکھنے کا ذریعہ وہ صحابہ تھے جو مدینہ سے نکل کر ممالک اسلامیہ میں ہر طرف پھیل گئے تھے۔ مثلاً اہل شام ابی بن کعب سے قرآن سیکھتے تھے۔ اہل کوفہ عبداللہ بن مسعود سے اور اہل عراق ابوموسیٰ اشعری سے۔ تاہم اختلاف لہجہ اور اختلاف کتابت کی وجہ سے دوبارہ لوگوں میں قرآن کے بارے میں اختلافات ہونے لگے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے (ككفر بعضهم بعضا، تبیان الجزائری)۔ ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں یزید بن معاویہ نخعی سے نقل کیا ہے کہ ولید بن عقبہ کے زمانہ میں ایک بار وہ کوفہ کی مسجد میں تھے۔ حذیفہ بن الیمان بھی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ مسجد میں ایک حلقہ قرآن کے ذکر میں مشغول تھا۔ ایک شخص نے کوئی آیت پڑھی اور کہا: قرأۃ عبداللہ بن مسعود۔ دوسرے نے اسی آیت کو کسی اور ڈھنگ سے پڑھا اور کہا قرأۃ ابی موسیٰ الاشعری۔ حضرت حذیفہ یہ سن کر غضب ناک ہو گئے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا:

هكذا كان من قبلكم اختلفوا، والله لاركبن الى امير المومنين	تم سے پہلے جو لوگ تھے، انھوں نے اسی طرح اختلاف کیا۔ خدا کی قسم میں سوار ہو کر امیر المومنین (عثمان) کے پاس جاؤں گا۔

عمارہ بن غزیہ کی روایت کے مطابق حذیفہ بن الیمان واپس آئے۔ وہ ایک فوجی افسر تھے اور اس وقت آرمینیہ میں

اہل شام سے اور آذر بائیجان میں اہل عراق سے جنگ کرکے لوٹے تھے۔ وہ مدینہ پہنچے تو اپنے مکان جانے کے بجائے سیدھے خلیفہ ثالث کے پاس آئے اور کہا:

یا امیر المومنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاریٰ	اے امیر المؤمنین لوگوں کو سنبھالئے، قبل اس کے کہ لوگ کتاب اللہ کے بارے میں اختلاف میں پڑ جائیں جس طرح یہود و نصاریٰ اختلاف میں پڑ گئے

حضرت عثمان کے زمانہ میں ایسی آبادیاں اسلام میں داخل ہوگئیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ عربی الفاظ و حروف کے صحیح تلفظ کی قدرت ظاہر ہے ان میں نہیں ہوسکتی تھی۔ خود عرب کے مختلف قبائل کے لہجے الگ الگ تھے۔ اس سے قرأت قرآن میں اختلاف پیدا ہوا۔ نتیجتاً نقل و تحریر میں بھی اختلاف شروع ہوگیا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ قبیلہ بنی ہذیل حتیٰ کو عتیٰ پڑھتا تھا۔ ابن مسعود اسی قبیلہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حتیٰ حین کو عتیٰ عین پڑھتے تھے۔ قبیلہ بنو اسد تعلمون کی ت کو زیر کے ساتھ (تِعلمون) پڑھتا تھا۔ مدینہ کے لوگ تابوت کا تلفظ تابوہ کرتے تھے۔ قبیلہ قیس ک تانیث کا تلفظ ش سے کرتے تھے اور قرآنی آیت کو قد جعل ربش تحتش سریا پڑھتے۔ اسی طرح قبیلہ تمیم ان کے لفظ کو عن کی شکل میں ادا کرتے تھے اور عسی اللہ عن یاتی بالفتح پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ س کو ت کی شکل میں ادا کرتا تھا اور اعوذ برب الناس ملک الناس الہ الناس پڑھتا تھا وغیرہ۔ ان حالات میں حذیفہ بن یمان صحابی کے مشورہ سے حضرت عثمان نے صدیقی نسخہ کی نقلیں تیار کرائیں اور تمام شہروں میں اس کا ایک ایک نسخہ بھیج دیا۔ یہ کام دوبارہ حضرت زید بن ثابت انصاری کی سرکردگی میں کرایا گیا اور ان کی مدد کے لئے گیارہ افراد مقرر کئے گئے۔ خلیفہ سوم کے حکم کے مطابق اس کمیٹی نے قرآن کو قریش کے لہجہ پر تحریر کیا جو کہ پیغمبر اسلام کا لہجہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ دوسرے نسخے جو لوگوں نے بطور خود لکھے ہیں وہ ان کو حکومت کے حوالے کردیں۔ چنانچہ ان کو جمع کرکے نذر آتش کر دیا گیا۔

اس طرح قرآن کو لکھاوٹ یعنی نوشت و کتابت کی حد تک ایک بنا دیا گیا۔ تاہم فطری اختلاف کی وجہ سے سارے لوگ ایک طرح قرآن کو پڑھنے پر قادر نہ ہوسکتے تھے۔ اس لئے لوگوں کو آزادی دے دی گئی کہ "سات" طریقوں یعنی متعدد لب و لہجہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ صدیق اکبر کا جمع قرآن آنحضرتؐ کی وفات کے ایک سال بعد انجام پایا تھا، عثمانی مصحف کی ترتیب آپؐ کی وفات کے پندرہ سال بعد ہوئی۔

تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے:

المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان ولیس کذلك انما حمل عثمان الناس علی القراة بوجه واحد	لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان جامع قرآن ہیں، حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ لوگوں کو قرآن کی ایک قرأت پر جمع کر دیا۔

بعض لوگوں نے تفنن طبع یا عناد کے طور پر اس قسم کی باتیں مشہور کیں کہ حضرت عثمان نے قرآن میں تحریفات کر ڈالیں۔ مثلاً قرآنی آیت قفوهم انهم مسئولون (صافات) کے آخر میں عن ولایة علی کے الفاظ تھے، جنھیں عہد

عثمانی میں بالقصد قرآن سے خارج کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے یہ مضحکہ خیز بات مشہور کی کہ "ولایت" کے نام سے ایک مستقل سورہ قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا۔ اس کو قرآن سے نکال دیا گیا، اس قسم کی باتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ان علینا جمعہ (قیامۃ) شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک بالاتفاق قرآن کی آیت ہے۔ پھر قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہوئے کیسے کوئی شخص اس قسم کی بے بنیاد باتوں کو مان سکتا ہے۔ مشہور شیعی عالم علامہ طبرسی نے لکھا ہے:

الزیادۃ فی القرآن مجمع علیہ بطلانہا، واما النقصان فقد روی عن قوم من اصحابنا وعن قوم من حشویۃ العامۃ، والصحیح خلاف ذلک

قرآن میں اضافہ (شیعہ و سنی دونوں کے) اجماع سے غلط ہے۔ باقی کمی تو بعض شیعوں سے اور عامہ کے حشویہ (یعنی اہل سنت کے محدثین) سے اس کا دعویٰ منقول ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھی محققین نے اس قسم کے دعوے نہیں کئے۔ یہ موقع پرستوں کے شوشے تھے جو انھوں نے سیاسی مقصد کے لئے وضع کئے۔ اہل بیت کی فضیلت کی ساری موضوعات اس لئے گھڑی گئیں تاکہ ان کے لئے خلافت کا استحقاق ثابت ہو جائے۔ مثلاً ایک غیر معروف شخص محمد بن جہم الہلالی تھے۔ انھوں نے امام جعفر صادق کی طرف منسوب کر کے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت امۃ ھی اربیٰ من امۃ (نحل) میں تحریف کی گئی ہے۔ اصل الفاظ تھے ائمتنا ھی ازکیٰ من ائمتکم (تفسیر روح المعانی مقدمہ) یعنی ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ و حکمراں بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت عثمان نے ۲۵ھ میں حفصہ بنت عمر کے پاس سے مصحف صدیقی منگوایا۔ اس وقت قرآن کے کاتب اول زید بن ثابت انصاری موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں آپ نے بارہ آدمیوں کی جماعت مقرر کی۔ انھوں نے صدیقی نسخہ کی بنیاد پر قرآن کی سات نقلیں تیار کیں۔ پھر یہ نسخے تمام اسلامی ملکوں میں بھیج دیئے گئے۔ حضرت عثمان نے حکم دیا کہ اس کے سوا جتنے مصاحف لوگوں نے بطور خود لکھ لئے ہیں وہ سب جلا دیئے جائیں۔ ایک نسخہ انھوں نے دار السلطنت مدینہ میں رکھا اور اس کا نام "الامام" رکھا اور بقیہ ہر گوشہ مملکت میں بھیج دیا۔ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں سے ہر جگہ ایک ایک نسخہ بھیجا۔

یہ مصحف بعد کی صدیوں میں انتہائی صحت کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ دور پریس میں پہنچ گیا جس کے بعد کسی ضیاع یا تغیر کا کوئی سوال نہیں۔ اس ابتدائی نسخہ کے ساتھ بعد کے نسخوں کی مطابقت کا کتنا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، اس کی دو چھوٹی سی مثال لیجئے۔ سورہ مومنوں کی آیت ۱۰۸ میں قال (الف کے ساتھ) لکھا ہوا ہے یہی لفظ اسی سورہ کی اگلی آیت ۱۱۲ میں قل (بغیر الف) لکھا گیا ہے۔ گویا ابتدائی مصحف میں جو لفظ جس شکل میں لکھا ہوا تھا ٹھیک اسی طرح اس کو لکھا جاتا رہا۔ خواہ ایک ہی لفظ، دو جگہ دو املاء کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح سورہ قیامہ کی آیت "وقیل من" کے بعد قاری تھوڑی دیر وقفہ کے لئے ٹھہرتا ہے۔ پھر "راق" پڑھتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہلکا وقف کیا تھا۔ قرآن میں اسی طرح کے دوسرے متعدد

مقامات ہیں، مگر کبھی قرآن پڑھنے والوں کو یہ خیال نہیں ہوا کہ بطور خود دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح وقفہ دے کر پڑھنا شروع کر دیں۔

آج جو قرآن مسلمانوں کے درمیان رائج ہے، اس کی صحت میں کسی فرقہ کا کوئی اختلاف نہیں۔ حتیٰ کہ محقق شیعہ علماء بھی اس معاملہ میں متفق ہیں۔ کتاب تاریخ القرآن لابی عبد اللہ الزنجانی شیعی (صفحہ ۴۶) میں نقل کیا ہے کہ علی بن موسیٰ المعروف بابن طاؤس (۶۶۴ھ — ۵۸۹ھ) جو محقق شیعہ علما میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب سعد السعود میں شہرستانی سے نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں سوید بن علقمہ سے روایت کیا ہے:

قال سمعت علی بن ابی طالب یقول: ایہا الناس، اللہ اللہ، ایاکم والغلو فی امر عثمان وقولکم حراق المصاحف۔ فواللہ ما حرقہا الا عن ملأ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعنا وقال: ما تقولون فی ھٰذہ القرأۃ التی اختلف الناس فیہا، یلقی الرجلُ الرجلَ فیقول: قرأتی خیر من قرأتك، وھذا یجر الی الکفر، فقلنا مالرای، قال ارید ان اجمع الناس علی مصحف واحد، فانکم ان اختلفتم الیوم کان من بعد کم اشد اختلافا، فقلنا نعم ما رأیت

وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت علی بن ابی طالب کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اے لوگو، اللہ اللہ، عثمان کے معاملہ میں غلو سے بچو۔ یہ نہ کہو کہ انھوں نے مصاحف کو جلایا۔ خدا کی قسم انھوں نے نہیں جلایا مگر اس وقت کہ انھوں نے صحابہ کی جماعت کو اکٹھا کیا اور پوچھا کہ تم قرآن میں اختلاف قرأت کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ ایک شخص دوسر سے ملتا ہے اور کہتا ہے۔ میری قرأت تمھاری قرأت سے بہتر ہے۔ اس قسم کی بات کفر تک جاتی ہے۔ صحابہ نے کہا آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دوں۔ کیوں کہ تم اگر آج اختلاف میں پڑ گئے تو تمھارے بعد کے لوگ اور زیادہ اختلاف میں پڑیں گے۔ تمام صحابہ نے کہا ہاں آپ کی رائے سے ہم کو اتفاق ہے۔

قرآن کا یہ ایسا وصف ہے جس کا معاندین تک نے اعتراف کیا ہے۔ سر ولیم میور لکھتے ہیں:

"محمد کی وفات کے ربع صدی بعد ہی ایسے منافشات اور فرقہ بندیاں ہو گئیں جس کے نتیجہ میں عثمان قتل کر دیے گئے، اور یہ اختلافات آج بھی باقی ہیں۔ مگر ان سب فرقوں کا قرآن ایک ہی ہے۔ ہر زمانہ میں یکساں طور پر سب فرقوں کا ایک ہی قرآن پڑھنا، اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ آج ہمارے سامنے وہی مصحف ہے جو اس بد قسمت خلیفہ (عثمان) کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔ شاید پوری دنیا میں کوئی دوسری ایسی کتاب نہیں ہے جس کی عبارت بارہ صدیوں تک اس طرح بغیر تبدیلی کے باقی ہو" لائف آف محمد (۱۹۱۲) دیباچہ

لین پول نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

"قرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہر حرف جو ہم آج پڑھتے ہیں، اس پر یہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ تقریباً تیرہ صدیوں سے غیر مبدل رہا ہے (سلکشن فرام دی قرآن)

جرمن محقق وان ہیمر غیر مسلم مستشرقین کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں"

اعجاز التنزیل صفحہ ۵۰۰

عہد عثمانی تک قرآن کے جتنے نسخے لکھے گئے وہ سب خط حیری میں تھے۔ حضرت علی کے زمانہ میں خط کی اصلاح ہوئی اور خط کوفی وجود میں آیا جو سابق خط کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ حضرت علی کے ندیم خاص ابوالاسود الدولی (۶۹ھ) نے پہلی بار اس خط کو بنایا اور پھر بنی امیہ کے عہد میں اس کو مزید ترقی ہوئی۔ قرآن میں اعراب لگانے کا آغاز بھی ابوالاسود دولی نے حضرت علی کے عہد میں کیا۔ اسی کی بنیاد پر حجاج بن یوسف نے بعد کو قرآن کے باقاعدہ معرب نسخے تیار کرائے۔ آج تک قرآن ٹھیک اسی نہج پر لکھا جا رہا ہے۔

عرب کا ریگستان: پٹرول سے بھی زیادہ بڑی دولت

سورج کی گرمی کو قابو میں لا کر اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے، یہ بات انسان کو بہت عرصہ سے معلوم تھی۔ مگر اس صنعت کو ترقی دینے میں ایک خاص رکاوٹ یہ تضاد تھا کہ وہ ممالک جو آفتابی حرارت کی زیادہ مقدار رکھتے ہیں وہ سب سے کم ترقی یافتہ تھے۔ وہ اتنے ذرائع نہیں رکھتے تھے کہ اس صنعت کو ترقی دینے کی قیمت ادا کر سکیں۔ دوسری طرف وہ قومیں جو ترقی یافتہ ہیں اور وسائل کی مالک ہیں وہ اکثر سرد ممالک میں اور زمین کے منطقہ حارہ سے دور واقع ہیں۔ مگر اب صورت حال بدل گئی ہے۔ عرب ممالک جو گرم صحراؤں کے مالک ہیں، پٹرول نے ان کو دولت سے بھی مالا مال کر دیا ہے۔

سعودی عرب ایک بڑے سرمایہ کی لاگت سے انرجی (طاقت) کے متبادل ذریعہ کی تلاش کر رہا ہے۔ سعودی عرب اس حقیقت سے واقف ہے کہ تیل کا ذخیرہ لامحدود نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اس سلسلے میں بڑے پیمانہ پر تحقیقات شروع کر دی ہیں

اس صحرائی ریاست کو ہر سال ۳۵۰۰ سے لے کر ۴۰۰۰ گھنٹے تک گرم سورج حاصل رہتا ہے۔ اس طرح جو گرمی اس کو ملتی ہے اس کا اوسط روزانہ تقریباً ۵۵۰ کیلوریز فی مربع سنٹی میٹر (550 cals/cm^2/day) ہے۔ سعودی عرب کا سورج، طور پر اس کے لئے تیل سے بھی زیادہ بڑی دولت ہے۔ سعودی عرب کا خیال ہے کہ ۲۰۰۰ء تک وہ آفتابی انرجی کے معاملہ میں خود کفیل ہو جائے گا۔ یہ انرجی مختلف کاموں میں استعمال ہو گی۔ مثلاً سمندر کے پانی کو میٹھا بنانا جو پینے کے لئے اور زراعت کے لئے استعمال ہو اور بجلی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے۔ اس وقت سعودی عرب میں چار بڑے انرجی پروجیکٹ تکمیل کے مرحلہ میں ہیں۔

سائنس ٹوڈے، اکتوبر ۱۹۷۸ء

مکتبہ الرسالہ کی کتابیں

آپ

دہلی کے کسی بھی مکتبہ سے

حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

اسلام کے خلاف جدید شبہات کو ڈھا دینے والی کتاب

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحیدالدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۶ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۶ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحیدالدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدی (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔

الامام الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے۔ انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی وشافی رد موجود ہے۔

قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اس کتاب کے عربی ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔۔۔۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدی بلاشک وشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے۔ ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

قیمت: تیرہ روپے پچاس پیسے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

Regd. No. D. (D) 532
Regd. R.N. No 28822/76
Issue No. XXVI

January 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Sreet, DELHI-110006 (INDIA)

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع